تلخیص

تفہیم القرآن

سورۃ النمل

ترجمہ و تفسیر

مولانا سیّد ابو الاعلیٰ مودودیؒ

تلخیص

مولانا صدر الدین اصلاحیؒ

اَلنَّمل

نام

دوسرے رکوع کی چوتھی آیت میں وَادِالنَّمْلِ کا ذکر آیا ہے۔سورہ کا نام اسی سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول

مضمون اور انداز بیان مکہ کے دَورِ متوسط کی سورتوں سے پوری مشابہت رکھتا ہے۔اور اس کی تائید روایات سے بھی ہوتی ہے۔ابن عباسؓ اور جابر بن زید کا بیان ہے کہ "پہلے سورۂ شعراء نازل ہوئی، پھر النمل، پھر القصص۔"

موضوع ومباحث

یہ سورۃ دو خطبوں پر مشتمل ہے۔ پہلا خطبہ آغازِ سورہ سے چوتھے رکوع کے خاتمے تک ہے۔اور دوسرا خطبہ پانچویں رکوع کی ابتدا سے سورۃ کے اختتام تک۔

پہلے خطبے میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی رہنمائی سے صرف وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں، جو اُن حقیقتوں کو تسلیم کریں جنہیں یہ کتاب اس کائنات کی بنیادی حقیقتوں کی حیثیت سے پیش کرتی ہے، اور پھر مان لینے کے بعد اپنی عملی زندگی میں بھی اطاعت واتباع کا رویہ اختیار کریں۔لیکن اس راہ پر آنے اور چلنے میں جو چیز سب سے بڑھ کر مانع ہوتی ہے وہ انکارِ آخرت ہے۔اس تمہید کے بعد تین قسم کی سیرتوں کے نمونے پیش کیے گئے ہیں۔

ایک نمونہ فرعون اور سردارانِ قوم ثمود اور سرکشانِ قوم لوط کا ہے، جن کی سیرت فکر آخرت سے بے نیازی اور نتیجتاً نفس کی بندگی سے تعمیر ہوئی تھی۔ یہ لوگ کسی نشانی کو دیکھ کر بھی ایمان لانے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ یہ اُلٹے ان لوگوں کے دشمن ہو گئے جنہوں نے ان کو خیر وصلاح کی طرف بلایا۔

دوسرا نمونہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا ہے جن کو خدا نے دولت، حکومت، اور شوکت وحشمت سے بڑے پیمانے پر نوازا تھا۔لیکن اس سب کے باوجود چونکہ وہ اپنے آپ کو خدا کے حضور جواب دہ سمجھتے تھے، اس لیے ان کا سر ہر وقت منعم حقیقی کے آگے جھکا رہتا تھا۔

تیسرا نمونہ ملکہ سبا کا ہے جو تاریخ عرب کی نہایت مشہور دولت مند قوم پر حکمراں تھی۔اس کے پاس تمام وہ اسباب جمع تھے جو کسی انسان کو غرورِ نفس میں مبتلا کر سکتے ہیں۔ پھر وہ ایک مشرک قوم سے تعلق رکھتی تھی۔تقلید آبائی کی بنا پر بھی، اور اپنی قوم میں اپنی سرداری برقرار رکھنے کی خاطر بھی، اس کے لیے دینِ شرک کو چھوڑ کر دینِ توحید اختیار کرنا بہت زیادہ مشکل تھا جتنا کسی

عام مشرک کے لیے ہوسکتا ہے۔ لیکن جب اِس پر حق واضح ہوگیا تو کوئی چیز اسے قبولِ حق سے نہ روک سکی، کیونکہ اس کی گمراہی محض ایک مشرک ماحول میں آنکھیں کھولنے کی وجہ سے تھی۔ نفس کی بندگی اور خواہشات کی غلامی کا مرض اس پر مسلط نہ تھا۔

دوسرے خطبہ میں سب سے پہلے کائنات کے چند نمایاں ترین مشہور حقائق کی طرف اشارے کر کے کفارِ مکہ سے پے در پے سوال کیا گیا ہے کہ بتاؤ، یہ حقائق اُس شرک کی شہادت دے رہے ہیں {یا توحید کی} ؟اس کے بعد کفار کے اصل مرض پر انگلی رکھ دی گئی ہے کہ جس چیز نے ان کو اندھا بہرا بنا رکھا ہے، وہ دراصل آخرت کا انکار ہے۔

اس بحث سے مقصود سونے والوں کو جھنجوڑ کر جگانا ہے۔ اس لیے چھٹے اور ساتویں رکوع میں پے در پے وہ باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں جو لوگوں میں آخرت کا احساس بیدار کریں۔

خاتمۂ کلام میں قرآن کی اصل دعوت، یعنی خدائے واحد کی بندگی کی دعوت نہایت مختصر، مگر انتہائی مؤثر انداز میں پیش کر کے لوگوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ اسے قبول کرنا تمہارے اپنے لیے نافع اور اسے رد کرنا تمہارے اپنے لیے ہی نقصان دہ ہے۔

اٰيَاتُهَا ٩٣ (٢٧) سُوْرَةُ النَّمْلِ مَكِّيَّةٌ (٤٨) رُكُوْعَاتُهَا ٧

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

طٰسٓ قف تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ ۙ ١ هُدًى وَّبُشْرٰى
لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ ٢ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ
بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ٣ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

ط،س۔ یہ آیات ہیں قرآن اور کتابِ مبین[۱] کی، ہدایت اور بشارت[۲] اُن ایمان لانے والوں کے لیے جو نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں[۳]، اور پھر وہ ایسے لوگ ہیں جو آخرت پر پورا یقین رکھتے ہیں[۴]۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے

[۱] "کِتَابٍ مُبِیْنٍ" کا ایک مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب اپنی تعلیمات اور اپنے احکام اور ہدایات کو بالکل واضح طریقے سے بیان کرتی ہے۔ دوسرا مطلب یہ کہ وہ حق اور باطل کا فرق نمایاں طریقے سے کھول دیتی ہے۔ اور ایک تیسرا مطلب یہ بھی ہے کہ اس کا کتابِ الٰہی ہونا ظاہر ہے۔

[۲] یعنی یہ آیات ہدایت اور بشارت ہیں۔ "ہدایت کرنے والی" اور "بشارت دینے والی" کہنے کے بجائے انہیں بجائے خود "ہدایت" اور "بشارت" کہا گیا جس سے رہنمائی اور بشارت کے وصف میں ان کے کمال کا اظہار مقصود ہے۔

[۳] یعنی قرآن مجید کی یہ آیات رہنمائی بھی صرف اُنہی لوگوں کی کرتی ہیں اور انجام نیک کی خوش خبری بھی صرف انہی لوگوں کو دیتی ہیں جن میں دو خصوصیات پائی جاتی ہوں: ایک یہ کہ وہ ایمان لائیں۔ اور قرآن اور محمد ﷺ کی دعوت کو قبول کرلیں۔ دوسری یہ کہ {اس دعوت کو محض قبول کر کے} نہ رہ جائیں بلکہ عملاً اتباع واطاعت کے لیے آمادہ ہوں۔ اور اس آمادگی کی اوّلین علامت یہ ہے کہ وہ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں۔

[۴] اگر چہ آخرت کا عقیدہ ایمانیات میں شامل ہے، اور اس بنا پر "ایمان لانے والوں" سے مراد ظاہر ہے کہ وہی لوگ ہیں جو توحید اور رسالت کے ساتھ آخرت پر بھی ایمان لائیں، لیکن ایمانیات کے ضمن میں اس کے آپ سے آپ شامل ہونے کے باوجود یہاں اس عقیدے کی اہمیت ظاہر کرنے کے لیے خاص طور پر زور دے کر اسے الگ بیان کیا گیا ہے۔ اس سے یہ ذہن نشین کرنا مقصود ہے کہ جو لوگ آخرت کے قائل نہ ہوں ان کے لیے اِس قرآن کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا بلکہ اس پر قدم رکھنا بھی محال ہے۔ کیونکہ اس طرزِ فکر کے لوگ طبعاً اپنا معیارِ خیر وشر صرف اُنہی نتائج سے متعین کرتے ہیں جو اِس دنیا میں ظاہر ہوتے یا ہو سکتے ہیں۔ اور ان کے لیے کسی ایسی نصیحت وہدایت کو قبول کرنا ممکن نہیں ہوتا جو انجامِ اُخروی کو سود وزیاں اور نفع ونقصان کا معیار قرار دے کر خیر وشر کا تعین کرتی ہو۔

زَیَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ فَهُمْ یَعْمَهُوْنَ ④ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ
لَهُمْ سُوْٓءُ الْعَذَابِ وَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ⑤
وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِیْمٍ عَلِیْمٍ ⑥ اِذْ قَالَ مُوْسٰى
لِاَهْلِهٖٓ اِنِّیْٓ اٰنَسْتُ نَارًا ؕ سَاٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ اٰتِیْكُمْ بِشِهَابٍ

ان کے لیے ہم نے اُن کے کرتوتوں کو خوش نما بنادیا ہے، اس لیے وہ بھٹکتے پھرتے ہیں۔[۵] یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے بری سزا ہے[۶] اور آخرت میں یہی سب سے زیادہ خسارے میں رہنے والے ہیں۔ اور (اے نبیؐ) بلاشبہ تم یہ قرآن ایک حکیم و علیم ہستی کی طرف سے پا رہے ہو۔[۷] (انھیں اُس وقت کا قصہ سناؤ) جب موسیٰؑ نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ[۸] "مجھے ایک آگ سی نظر آئی ہے، میں ابھی یا تو وہاں سے کوئی خبر لے کر آتا ہوں یا کوئی انگارا چن لاتا ہوں

[۵] یعنی خدا کا قانونِ فطرت یہ ہے، نفسیاتِ انسانی کی فطری منطق یہی ہے کہ جب آدمی زندگی اور اس کی سعی و عمل کے نتائج کو صرف اِسی دنیا تک محدود سمجھے گا، تو لازماً اس کے اندر ایک مادہ پرستانہ نقطۂ نظر نشوونما پائے گا۔ اسے حق اور باطل، شرک اور توحید، نیکی اور بدی، اخلاق اور بداخلاقی کی ساری بحثیں سراسر بے معنی نظر آئیں گی۔ اس کی اصل مطلوب حیاتِ دنیا کی زینتیں اور کامرانیاں ہوں گی جن کے حصول کی فکر اسے ہر وادی میں لیے بھٹکتی پھرے گی۔ اور اس مقصد کے لیے جو کچھ بھی وہ کرے گا اسے اپنے نزدیک بڑی خوبی کی بات سمجھے گا۔

کسی کے اعمال بد کو اس کے لیے خوش نما بنادینے کا یہ فعل قرآن مجید میں کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور کبھی شیطان کی طرف۔ جب اسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے تو اس سے مراد، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، یہ ہوتی ہے کہ جو شخص یہ نقطۂ نظر اختیار کرتا ہے، اسے فطرتاً زندگی کا یہی ہنجار خوش آئند محسوس ہوتا ہے۔ اور جب یہ فعل شیطان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس {طرزِ فکر اور} طرزِ عمل کو اختیار کرنے والے آدمی کے سامنے شیطان ہر وقت ایک خیالی جنت پیش کرتا رہتا ہے اور اسے خوب اطمینان دلاتا ہے کہ شاباش برخوردار بہت اچھے جا رہے ہو۔

[۶] اس بُری سزا کی صورت، وقت اور جگہ کا تعین نہیں کیا گیا ہے، کیونکہ یہ اِس دنیا میں بھی مختلف افراد، گروہوں اور قوموں کو بے شمار مختلف طریقوں سے ملتی ہے، اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت عینِ موت کے دروازے پر بھی اس کا ایک حصہ ظالموں کو پہنچتا ہے، موت کے بعد عالم برزخ میں بھی اس سے آدمی دوچار ہوتا ہے، اور پھر روزِ حشر سے تو اس کا ایک سلسلہ شروع ہوجائے گا جو پھر کہیں جاکر ختم نہ ہوگا۔

[۷] یعنی یہ {باتیں} ایک حکیم و علیم ذات اِلقا کر رہی ہے جو حکمت و دانائی اور علم و دانش میں کامل ہے، جسے اپنی خلق کے مصالح اور ان کے ماضی و حال اور مستقبل کا پورا علم ہے، اور جس کی حکمت بندوں کی اصلاح و ہدایت کے لیے بہترین تدابیر اختیار کرتی ہے۔

[۸] یہ اُس وقت کا قصہ ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین میں آٹھ دس سال گزارنے کے بعد اپنے اہل و عیال کو ساتھ لے کر کوئی ٹھکانا تلاش کرنے جا رہے تھے۔

اس کی تفصیلات اس سے پہلے سورۂ طٰہٰ رکوع ۱ میں گزر چکی ہیں اور آگے سورۂ قصص (رکوع ۴) میں آ رہی ہیں۔

قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ۝٧ فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِيَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ
فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝٨ يٰمُوْسٰٓى اِنَّهٗٓ
اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝٩ وَاَلْقِ عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا
جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ؕ يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ ۫ اِنِّيْ لَا يَخَافُ

تا کہ تم لوگ گرم ہوسکو[9]۔'' وہاں جو پہنچا تو ندا آئی[10] کہ ''مبارک ہے وہ جو اس آگ میں ہے اور جو اِس کے ماحول میں ہے۔ پاک ہے اللہ، سب جہان والوں کا پروردگار[11]۔ اے موسیٰؑ یہ میں ہوں اللہ، زبردست اور دانا۔ اور پھینک تو ذرا اپنی لاٹھی۔'' جونہی کہ موسیٰؑ نے دیکھا لاٹھی سانپ کی طرح بل کھا رہی ہے[12] تو پیٹھ پھیر کر بھاگا اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ ''اے موسیٰؑ، ڈرو نہیں۔

[9] فحوائے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ رات کا وقت اور جاڑے کا موسم تھا۔ اور حضرت موسیٰؑ ایک اجنبی علاقے سے گزر رہے تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنے گھر والوں سے فرمایا کہ میں جا کر معلوم کرتا ہوں یہ کون سی بستی ہے جہاں آگ جل رہی ہے، آگے کدھر کدھر راستے جاتے ہیں اور کون کون سی بستیاں قریب ہیں۔ تاہم اگر وہ بھی ہماری ہی طرح کوئی چلتے پھرتے مسافر ہوئے جن سے کوئی معلومات حاصل نہ ہوسکیں تو کم از کم میں کچھ انگارے ہی لے آؤں گا کہ تم لوگ آگ جلا کر کچھ گرمی حاصل کر سکو۔

[10] سورۂ قصص میں ہے کہ ندا ایک درخت سے آ رہی تھی، فِي الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ۔ اس سے جو صورت معاملہ سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ وادی کے کنارے ایک خطے میں آگ سی لگی ہوئی تھی، مگر نہ کچھ جل رہا تھا نہ کوئی دھواں اُٹھ رہا تھا اور اس آگ کے اندر ایک ہرا بھرا درخت کھڑا تھا جس پر سے یکا یک یہ ندا آنی شروع ہوئی۔ یہ {نزول وحی کا اچانک آغاز} ایک عجیب معاملہ ہے جو انبیاء علیہم السلام کے ساتھ پیش آتا رہا ہے۔ ان مواقع پر درحقیقت ایک ایسی غیر معمولی کیفیت خارج میں بھی اور انبیاء علیہم السلام کے نفس میں بھی موجود ہوتی ہے جس کی بنا پر انہیں اس امر کا یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ یہ کسی جنّ یا شیطان یا خود ان کے اپنے ذہن کا کوئی کرشمہ نہیں ہے، نہ اُن کے حواس کوئی دھوکا کھا رہے ہیں، بلکہ فی الواقع یہ خداوندِ عالم یا اس کا فرشتہ ہی ہے جو ان سے ہم کلام ہے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو النجم، حاشیہ ١٠)

[11] اس موقع پر ''سبحان اللہ'' ارشاد فرمانے سے دراصل حضرت موسیٰؑ کو اس بات پر متنبہ کرنا مقصود تھا کہ یہ معاملہ کمال درجہ تنزیہ کے ساتھ پیش آ رہا ہے۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ اللہ ربّ العالمین اس درخت پر بیٹھا ہو، یا اس میں حلول کر آیا ہو، یا اس کا نورِ مطلق تمہاری بینائی کے حدود میں سما گیا ہو، یا کوئی زبان کسی منہ میں حرکت کر کے یہاں کلام کر رہی ہو، بلکہ ان تمام محدودیتوں سے پاک اور منزہ ہوتے ہوئے وہ بذاتِ خود تم سے مخاطب ہے۔

[12] سورۂ اعراف اور سورۂ شعراء میں اس کے لیے ثعبان (اژدہے) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور یہاں اسے ''جان'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے جو چھوٹے سانپ کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جسامت میں وہ اژدہا تھا، مگر اس کی حرکت کی تیزی ایک چھوٹے سانپ جیسی تھی۔ اسی مفہوم کو سورۂ طٰہٰ میں حَيَّةٌ تَسْعٰى (دوڑتے ہوئے سانپ) کے الفاظ میں ادا کیا گیا ہے۔

لَدَيَّ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿١٠﴾ اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّيْ
غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١١﴾ وَاَدْخِلْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ
سُوْٓءٍ ۣ فِيْ تِسْعِ اٰيٰتٍ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهٖ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا
فٰسِقِيْنَ ﴿١٢﴾ فَلَمَّا جَاۗءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ
مُّبِيْنٌ ﴿١٣﴾ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ۭ فَانْظُرْ

میرے حضور رسول ڈرا نہیں کرتے،[١٣] اِلاّ یہ کہ کسی نے قصور کیا ہو۔[١٤] پھر اگر برائی کے بعد اُس نے بھلائی سے (اپنے فعل کو) بدل لیا تو میں معاف کرنے والا مہربان ہوں۔[١٥] اور ذرا اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں تو ڈالو۔ چمکتا ہوا نکلے گا بغیر کسی تکلیف کے۔ یہ (دو نشانیاں) نو نشانیوں میں سے ہیں فرعون اور اس کی قوم کی طرف (لے جانے کے لیے)،[١٦] وہ بڑے بدکردار لوگ ہیں۔'' مگر جب ہماری کھلی کھلی نشانیاں اُن لوگوں کے سامنے آئیں تو انہوں نے کہا کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔ انہوں نے سراسر ظلم اور غرور کی راہ سے ان نشانیوں کا انکار کیا حالانکہ دل ان کے قائل ہو چکے تھے۔[١٧]

[١٣] یعنی میرے حضور اس امر کا کوئی خطرہ نہیں ہے کہ رسول کو کوئی گزند پہنچے۔ رسالت کے منصبِ عظیم پر مقرر کرنے کے لیے جب میں کسی کو اپنی پیشی میں بلاتا ہوں تو اس کی حفاظت کا خود ذمہ دار ہوتا ہوں۔

[١٤] یہ استثنا متصل بھی ہو سکتا ہے اور منقطع بھی۔ متصل ہونے کی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ خوف کی معقول وجہ اگر ہو سکتی ہے تو یہ کہ رسول سے کوئی قصور سرزد ہوا ہو۔ اور منقطع ہونے کی صورت میں مراد یہ ہوگی کہ میرے حضور تو کسی کو بھی کوئی خطرہ نہیں ہے جب تک کہ آدمی قصوروار نہ ہو۔

[١٥] یعنی قصور کرنے والا بھی اگر توبہ کر کے اپنے رویے کی اصلاح کر لے تو میرے ہاں اس کے لیے عفو و درگزر کا دروازہ کھلا ہے۔ اس موقع پر یہ بات ارشاد فرمانے سے مقصود ایک تنبیہ بھی تھی اور بشارت بھی۔ {تنبیہ ایک قبطی کے قتل پر اگرچہ وہ نادانستہ ہی سرزد ہو گیا تھا اور بشارت اس معافی پر جوان کی عفوطلبی پر انہیں عطا ہوئی تھیں۔ ملاحظہ ہو القصص، آیت:١٦}۔ گویا مطلب اس تقریر کا یہ ہوا کہ اے موسیٰ، میرے حضور تمہارے لیے ڈرنے کی ایک وجہ تو ضرور ہو سکتی تھی، کیونکہ تم سے ایک قصور سرزد ہو گیا تھا، لیکن جب تم اس برائی کو بھلائی سے بدل چکے ہو تو میرے پاس تمہارے لیے اب مغفرت اور رحمت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کوئی سزا دینے کے لیے اِس وقت میں نے تمہیں نہیں بلایا ہے بلکہ بڑے بڑے معجزات دے کر میں تمہیں ایک کارِ عظیم پر بھیجنے والا ہوں۔

[١٦] سورۂ بنی اسرائیل {آیت ١٠١} میں فرمایا گیا ہے کہ موسیٰ کو ہم نے صریح طور پر نظر آنے والی نو نشانیاں (تِسْعَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ) عطا فرمائی تھیں۔ اور سورۂ اعراف میں ان کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو، بنی اسرائیل، حاشیہ ١١٣ اور الزخرف، حاشیہ ٤٣)

[١٧] قرآن میں دوسرے مقامات پر بیان کیا گیا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام کے اعلان کے مطابق کوئی بلائے عام مصر پر نازل

كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿١٤﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ
عِلْمًا ۚ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ
الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٥﴾ وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا

اب دیکھ لو کہ ان مفسدوں کا انجام کیسا ہوا۔ؑ

(دوسری طرف) ہم نے داوٗدؑ اور سلیمانؑ کو علم عطا کیا[١٨] اور اُنہوں نے کہا کہ شکر ہے اُس خدا کا جس نے ہم کو اپنے بہت سے مومن بندوں پر فضیلت عطا کی۔[١٩] اور داوٗدؑ کا وارث سلیمانؑ ہوا۔[٢٠] اور اس نے کہا ''لوگو، ہمیں پرندوں کی بولیاں سکھائی گئی ہیں[٢١]

ہوتی تھی تو فرعون حضرت موسیٰؑ سے کہتا تھا کہ تم اپنے خدا سے دعا کر کے اس بلا کو ٹلوا دو، پھر جو کچھ تم کہتے ہو وہ ہم مان لیں گے۔ مگر جب وہ بلا ٹل جاتی تھی تو فرعون اپنی اُسی ہٹ دھرمی پر تل جاتا تھا (الاعراف، آیت ١٣٤۔ الزخرف، آیت ٤٩، ٥٠)۔ بائیبل میں بھی اس کا ذکر موجود ہے (خروج، باب ٨ تا ١٠)۔ اور ویسے بھی یہ کھلے ہوئے معجزے تھے {کہ انھیں ایک بے وقوف سے بے وقوف آدمی بھی اللہ تعالیٰ کے صرف تصرف خاص ہی کا نتیجہ سمجھ سکتا تھا}۔ اسی بنا پر حضرت موسیٰؑ نے فرعون سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ ''تو خوب جان چکا ہے کہ یہ نشانیاں مالک زمین و آسمان کے سوا کسی اور نے نازل نہیں کی ہیں۔'' (بنی اسرائیل، آیت ١٠٢)

[١٨] یعنی حقیقت کا علم۔ اِس بات کا علم کہ درحقیقت ان کے پاس اپنا کچھ بھی نہیں ہے، جو کچھ ہے اللہ کا عطیہ ہے، اور اُس پر تصرف کرنے کے جو اختیارات بھی ان کو بخشے گئے ہیں انہیں اللہ ہی کی مرضی کے مطابق استعمال کیا جانا چاہیے اور اس اختیار کے صحیح و غلط استعمال پر انہیں مالک حقیقی کے حضور جواب دہی کرنی ہے۔ یہ علم اُس جہالت کی ضد ہے جس میں فرعون مبتلا تھا۔ اُس جہالت نے جو سیرت تعمیر کی تھی اس کا نمونہ اوپر مذکور ہوا۔ اب بتایا جاتا ہے کہ یہ علم کیسی سیرت کا نمونہ تیار کرتا ہے۔

[١٩] یعنی دوسرے مومن بندے بھی ایسے موجود تھے جن کو خلافت عطا کی جاسکتی تھی۔ لیکن یہ ہماری کوئی ذاتی خوبی نہیں بلکہ محض اللہ کا احسان ہے کہ اس نے ہمیں اس مملکت کی فرماں روائی کے لیے منتخب فرمایا۔

[٢٠] وراثت سے مراد مال و جائداد کی وراثت نہیں بلکہ نبوت اور خلافت میں حضرت داوٗدؑ کی جانشینی ہے۔ مال و جائداد کی میراث اگر بالفرض منتقل ہوئی بھی ہو تو وہ تنہا حضرت سلیمانؑ ہی کی طرف منتقل نہیں ہوسکتی تھی، کیونکہ حضرت داوٗدؑ کی دوسری اولاد بھی موجود تھی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام حضرت داوٗدؑ کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ ان کا اصل عبرانی نام سولومون تھا جو ''سلیم'' کا ہم معنی ہے۔ ٩٦٥ قبل مسیح میں حضرت داوٗدؑ کے جانشین ہوئے اور ٩٢٦ ق م تک تقریباً ٤٠ سال فرماں روا رہے۔ ان کی مملکت صرف موجودہ فلسطین و شرقِ اردن پر مشتمل تھی اور شام کا ایک حصہ بھی اس میں شامل تھا۔

[٢١] بائیبل اس ذکر سے خالی ہے کہ حضرت سلیمانؑ کو پرندوں اور جانوروں کی بولیوں کا علم دیا گیا تھا۔ لیکن بنی اسرائیل کی روایات میں اس کی صراحت موجود ہے۔ (جیوش انسائکلو پیڈیا۔ جلد ١١۔ ص ٤٣٩)

مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ۭ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ⑯
وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ
يُوْزَعُوْنَ ⑰ حَتّٰٓى اِذَآ اَتَوْا عَلٰي وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰٓاَيُّهَا
النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ

اور ہمیں ہر طرح کی چیزیں دی گئی ہیں،[۲۲] بے شک یہ (اللہ کا) نمایاں فضل ہے۔" سلیمانؑ کے لیے جن اور انسانوں اور پرندوں کے لشکر جمع کیے گئے تھے[۲۳] اور وہ پورے ضبط میں رکھے جاتے تھے۔ (ایک مرتبہ وہ ان کے ساتھ کوچ کر رہا تھا) یہاں تک کہ جب یہ سب چیونٹیوں کی وادی میں پہنچے تو ایک چیونٹی نے کہا "اے چیونٹیو، اپنے بلوں میں گھس جاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمانؑ اور اس کے لشکر تمہیں کچل ڈالیں اور انھیں خبر بھی نہ ہو۔[۲۴]"

[۲۲] یعنی اللہ کا دیا ہمارے پاس سب کچھ موجود ہے۔

[۲۳] بائیبل میں اس کا بھی کوئی ذکر نہیں ہے کہ جن حضرت سلیمانؑ کے لشکروں میں شامل تھے اور وہ ان سے خدمت لیتے تھے۔ لیکن تلمود اور ربیوں کی روایات میں اس کا تفصیلی ذکر ملتا ہے (جیوش انسائکلو پیڈیا جلد ١١ صفحہ ٤٤٠)۔ موجودہ زمانہ کے بعض لوگوں نے یہ ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے کہ جن (سے مراد پہاڑی قبائل کے دیو ہیکل لوگ اور طیر سے مراد گھوڑسواروں کے تیز رو دستے ہیں نہ کہ جنات اور پرندے)۔ لیکن یہ قرآن مجید میں بے جا تاویل کی بدترین مثالیں ہیں۔ قرآن یہاں جن، انس اور طیر، تین الگ الگ اقسام کے لشکر بیان کر رہا ہے اور تینوں پر الف ل تعریف جنس کے لیے لایا گیا ہے۔ اس لیے لامحالہ الجن اور الطیر، الانس میں شامل نہیں ہو سکتے بلکہ وہ اس سے مختلف دو الگ اجناس ہی ہو سکتی ہیں۔ علاوہ بریں کوئی شخص جو عربی زبان سے ذرہ برابر بھی واقفیت رکھتا ہو، یہ تصور نہیں کر سکتا کہ اس زبان میں محض لفظ الجن بول کر انسانوں کا کوئی گروہ، یا محض الطیر بول کر سواروں کا رسالہ کبھی مراد لیا جا سکتا ہے پھر آگے ان دونوں گروہوں کے ایک ایک فرد کا جو حال اور کام بیان کیا گیا ہے وہ بھی اس تاویل کے بالکل خلاف معنی پر صریح دلالت کر رہا ہے۔

[۲۴] اس آیت کو بھی آج کل کے بعض مفسرین نے تاویل کے خراد پر چڑھایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وادی النمل سے مراد چیونٹیوں کی وادی نہیں ہے بلکہ یہ ایک وادی کا نام ہے جو شام کے علاقے میں تھی اور نملة کے معنی ایک چیونٹی کے نہیں ہیں بلکہ یہ ایک قبیلہ کا نام ہے۔ اس طرح وہ آیت کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ "جب حضرت سلیمانؑ وادی النمل میں پہنچے تو ایک نملی نے کہا کہ اے قبیلۂ نمل کے لوگو......" لیکن یہ بھی ایسی تاویل ہے جس کا ساتھ قرآن کے الفاظ نہیں دیتے۔ اگر بالفرض وادی النمل کو اُس وادی کا نام مان لیا جائے، اور یہ بھی مان لیا جائے کہ وہاں بنی النمل نام کا کوئی قبیلہ رہتا تھا، تب بھی یہ بات عربی زبان کے استعمالات کے بالکل خلاف ہے کہ قبیلۂ نمل کے ایک فرد کو نملہ کہا جائے۔

عقلی حیثیت سے یہ بات کچھ بھی بعید نہیں ہے کہ ایک چیونٹی اپنی جنس کے افراد کو کسی آتے ہوئے خطرے سے خبردار کرے اور بلوں میں گھس جانے کے لیے کہے۔ رہی یہ بات کہ حضرت سلیمانؑ نے اس کی بات کیسے سن لی، تو جس شخص کے حواس کلامِ وحی جیسی

لَا يَشْعُرُوْنَ ۝١٨ فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ
اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ
صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ ۝١٩
وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَآ اَرَى الْهُدْهُدَ ۖ اَمْ كَانَ مِنَ
الْغَآئِبِيْنَ ۝٢٠ لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا اَوْ لَاَاذْبَحَنَّهٗٓ اَوْ لَيَاْتِيَنِّيْ
بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝٢١ فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيْدٍ فَقَالَ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ

سلیمانؑ اس کی بات پر مسکراتے ہوئے ہنس پڑا اور بولا "اے میرے رب، مجھے قابو میں[٢٥] رکھ کہ میں تیرے اس احسان کا شکر ادا کرتا رہوں جو تونے مجھ پر اور میرے والدین پر کیا ہے اور ایسا عمل صالح کروں جو تجھے پسند آئے اور اپنی رحمت سے مجھ کو اپنے صالح بندوں میں داخل کر۔[٢٦]"

(ایک اَور موقع پر) سلیمانؑ نے پرندوں کا جائزہ لیا[٢٧] اور کہا "کیا بات ہے کہ میں فلاں ہُد ہُد کو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ کیا وہ کہیں غائب ہو گیا ہے؟ میں اسے سخت سزا دوں گا، یا ذبح کر دوں گا، ورنہ اسے میرے سامنے معقول وجہ پیش کرنی ہوگی۔[٢٨]" کچھ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ اُس نے آ کر کہا "میں نے وہ معلومات حاصل کی ہیں جو آپ کے علم میں نہیں ہیں۔

لطیف چیز کا ادراک کر سکتے ہوں، اس کے لیے چیونٹی کے کلام جیسی کثیف (Crude) چیز کا ادراک کر لینا کوئی بڑی مشکل بات نہیں ہے۔

[٢٥] اصل الفاظ میں رَبِّ اَوْزِعْنِیْ۔ وزع کے اصل معنی عربی زبان میں روکنے کے ہیں۔ اس موقع پر حضرت سلیمانؑ کا اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ (مجھے روک کہ میں تیرے احسان کا شکر ادا کروں) ہمارے نزدیک دراصل یہ معنی دیتا ہے کہ اے میرے رب جو عظیم الشان قوتیں اور قابلیتیں تو نے مجھے دی ہیں وہ ایسی ہیں کہ اگر میں ذرا سی غفلت میں بھی مبتلا ہو جاؤں تو حدِ بندگی سے خارج ہو کر اپنی کبریائی کے خبط میں نہ معلوم کہاں سے کہاں نکل جاؤں۔ اس لیے اے میرے پروردگار، تو مجھے قابو میں رکھ تاکہ میں کافر نعمت بننے کے بجائے شکرِ نعمت پر قائم رہوں۔

[٢٦] صالح بندوں میں داخل کرنے سے مراد غالباً یہ ہے کہ آخرت میں میرا انجام صالح بندوں کے ساتھ ہو اور میں ان کے ساتھ جنت میں داخل ہوں۔ اس لیے کہ آدمی جب عمل صالح کرے گا تو صالح تو وہ آپ سے آپ ہو گا ہی، البتہ آخرت میں کسی کا جنت میں داخل ہونا محض اس کے عمل صالح کے بل بوتے پر نہیں ہو سکتا بلکہ یہ اللہ کی رحمت پر موقوف ہے۔

[٢٧] یعنی اُن پرندوں کا جن کے متعلق اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ جن اور انس کی طرح ان کے لشکر بھی حضرت سلیمانؑ کے عساکر میں شامل تھے۔ ممکن ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام ان سے خبر رسانی، شکار اور اسی طرح کے دوسرے کام لیتے ہوں۔

[٢٨] موجودہ زمانے کے بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہدہد سے مراد وہ پرندہ نہیں ہے جو عربی اور اُردو زبان میں اس نام سے معروف

بِهٖ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍۭ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ ۝۲۲ اِنِّيْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ

میں سبا کے متعلق یقینی اطلاع لے کر آیا ہوں۔[۲۹] میں نے وہاں ایک عورت دیکھی جو اس قوم کی حکمراں ہے۔

ہے بلکہ یہ ایک آدمی کا نام ہے جو حضرت سلیمانؑ کی فوج میں ایک افسر تھا۔ اس دعوے کی بنیاد {اس بات پر رکھی} گئی ہے کہ جانوروں کے ناموں پر انسانوں کے نام رکھنے کا رواج تمام زبانوں کی طرح عربی زبان میں بھی پایا جاتا ہے اور عبرانی میں بھی تھا۔ نیز یہ کہ آگے اس ہُد ہُد کا جو کام بیان کیا گیا ہے اور حضرت سلیمانؑ سے اس کی گفتگو کا جو ذکر ہے وہ ان کے نزدیک صرف ایک انسان ہی کر سکتا ہے۔ لیکن قرآن مجید کے سیاقِ کلام کو آدمی دیکھے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ قرآن کی تفسیر نہیں بلکہ اس کی تحریف، اور اس سے بھی کچھ بڑھ کر اس کی تغلیط ہے۔ اس سلسلہ میں ذرا قرآن مجید کے بیان کی ترتیب ملاحظہ فرمائیے:

پہلے ارشاد ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے اللہ کے اس فضل پر اظہارِ امتنان کیا کہ ”ہمیں منطق الطیر کا علم دیا گیا ہے۔“ اس فقرے میں، اگر طیر سے مراد پرند نہیں بلکہ انسانوں کا کوئی گروہ ہو تو اس کے لیے منطق (بولی) کے بجائے لغت یا لسان (یعنی زبان) کا لفظ زیادہ صحیح ہوتا۔

اس کے بعد فرمایا گیا کہ ”سلیمان کے لیے جن اور انس اور طیر کے لشکر جمع کیے گئے تھے۔“ اس فقرے میں اوّل تو جن اور انس اور طیر، تین معروف اسمائے جنس استعمال ہوئے ہیں جو تین مختلف اور معلوم اجناس کے لیے عربی زبان میں مستعمل ہیں۔ پھر انہیں مطلق استعمال کیا گیا ہے اور کوئی قرینہ ان میں سے کسی کے استعارہ و مجاز یا تشبیہ ہونے کا موجود نہیں ہے جس سے ایک آدمی لغت کے معروف معنوں کے سوا کسی اور معنی میں انہیں لے۔ پھر اِنس کا لفظ جن اور طیر کے درمیان آیا ہے جو یہ معنی لینے میں صریحاً مانع ہے کہ جن اور طیر دراصل اِنس ہی کی جنس کے دو گروہ تھے۔ یہ معنی مراد ہوتے تو الجن و الطیر من الأنس کہا جاتا نہ کہ من الجن و الاِنس و الطیر۔

پھر حضرت سلیمانؑ ہُد ہُد کو غائب دیکھ کر فرماتے ہیں کہ ہد ہد یا تو اپنے غائب ہونے کی کوئی معقول وجہ بیان کرے ورنہ میں اسے سخت سزا دوں گا یا ذبح کر دوں گا۔ انسان کو قتل کیا جاتا ہے، پھانسی دی جاتی ہے، سزائے موت دی جاتی ہے، ذبح کون کرتا ہے؟ کوئی بڑا ہی سنگ دل اور بے درد آدمی جوشِ انتقام میں اندھا ہو چکا ہو تو شاید کسی آدمی کو ذبح بھی کر دے، مگر کیا پیغمبر سے ہم یہ توقع کریں کہ وہ اپنی فوج کے ایک آدمی کو محض غیر حاضر ہونے کے جرم میں ذبح کر دینے کا اعلان کرے گا۔

کچھ دور آگے چل کر ابھی آپ دیکھیں گے کہ حضرت سلیمانؑ اسی ہُد ہُد کو ملکۂ سبا کے نام خط دے کر بھیجتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اسے ان کی طرف ڈال دے یا پھینک دے (اَلْقِهْ اِلَيْهِمْ)۔ ظاہر ہے کہ یہ ہدایت پرندے کو تو دی جا سکتی ہے لیکن کسی آدمی کو سفیر یا ایلچی یا قاصد بنا کر بھیجنے کی صورت میں یہ انتہائی غیر موزوں {اور ناشائستہ بات ہوگی}۔

یہ تمام قرائن صاف بتا رہے ہیں کہ یہاں ہُد ہُد کا مفہوم وہی ہے جو از روئے لغت اس لفظ کا مفہوم ہے، یعنی یہ کہ وہ انسان نہیں بلکہ ایک پرندہ تھا۔

[۲۹] سبا جنوبی عرب کی مشہور تجارت پیشہ قوم تھی جس کا دار الحکومت مارِب، موجودہ یمن کے دار السلطنت صنعاء سے ۵۵ میل بجانب شمال مشرق واقع تھا۔ اس کا زمانۂ عروج معین کی سلطنت کے زوال کے بعد تقریباً ۱۱۰۰ ق م سے شروع ہوا اور یک ہزار سال تک یہ عرب میں اپنی عظمت کے ڈنکے بجاتی رہی۔

ہُد ہُد کا یہ بیان کہ ”میں نے وہ معلومات حاصل کی ہیں جو آپ کے علم میں نہیں ہیں“ یہ معنی نہیں رکھتا کہ حضرت سلیمانؑ سبا سے بالکل ناواقف تھے۔ ظاہر ہے کہ فلسطین و شام کے جس فرماں روا کی سلطنت بحرِ احمر کے شمالی کنارے (خلیج عقبہ) تک پہنچی ہوئی تھی وہ اسی بحرِ احمر کے جنوبی کنارے (یمن) کی ایک ایسی قوم سے ناواقف نہ ہو سکتا تھا جو بین الاقوامی تجارت کے ایک اہم حصے پر قابض تھی۔

وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ وَّلَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ ۝٢٣ وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا
يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ
فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ ۝٢٤ اَلَّا يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ
الَّذِيْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ
وَمَا تُعْلِنُوْنَ ۝٢٥ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۝٢٦ السجدة

السجدة ٨

اُس کو ہر طرح کا سروسامان بخشا گیا ہے اور اُس کا تخت بڑا عظیم الشان ہے۔ میں نے دیکھا کہ وہ اور اس کی قوم اللہ کے بجائے سورج کے آگے سجدہ[۳۰] کرتی ہے۔''[۳۱] شیطان نے ان کے اعمال ان کے لیے خوش نما بنادیے[۳۲] اور انھیں شاہراہ سے روک دیا، اس وجہ سے وہ یہ سیدھا راستہ نہیں پاتے کہ اُس خدا کو سجدہ کریں جو آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ چیزیں نکالتا ہے[۳۳] اور وہ سب کچھ جانتا ہے جسے تم لوگ چھپاتے اور ظاہر کرتے ہو۔[۳۴] اللہ کہ جس کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں، جو عرش عظیم کا مالک ہے۔[۳۵]

اس لیے ہُدہُد کے قول کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ قوم سبا کے مرکز میں جو چشم دید حالات میں دیکھ کر آیا ہوں وہ ابھی تک آپ کو نہیں پہنچے ہیں۔

[۳۰] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم اس زمانے میں آفتاب پرستی کے مذہب کی پیرو تھی۔ عرب کی قدیم روایات سے بھی اس کا یہی مذہب معلوم ہوتا ہے۔

[۳۱] اندازِ کلام سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہاں سے {آیت ۲۶ کے آخر تک ہدہد کے قول پر اللہ تعالیٰ کا اپنا اضافہ ہے}۔ اس قیاس کو جو چیز تقویت دیتی ہے وہ یہ فقرہ ہے وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ، ''اور وہ سب کچھ جانتا ہے جسے تم چھپاتے اور ظاہر کرتے ہو۔'' علامہ آلوسی، صاحب روح المعانی بھی اسی قیاس کو ترجیح دیتے ہیں۔

[۳۲] یعنی دنیا کی دولت کمانے اور اپنی زندگی کو زیادہ سے زیادہ شان دار بنانے کے جس کام میں وہ منہمک تھے، شیطان نے اُن کو سجھا دیا کہ بس یہی عقل وفکر کا ایک مصرف اور قوائے ذہنی وجسمانی کا ایک استعمال ہے، اِس سے زیادہ کسی چیز پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی حاجت ہی نہیں ہے۔

[۳۳] یعنی جو ہر آن اُن چیزوں کو ظہور میں لا رہا ہے جو پیدائش سے پہلے نہ معلوم کہاں کہاں پوشیدہ تھیں۔ زمین کے پیٹ سے ہر آن بے شمار نباتات نکال رہا ہے اور طرح طرح کے معدنیات خارج کر رہا ہے۔ عالم بالا کی فضاؤں سے وہ وہ چیزیں سامنے لا رہا ہے جن کے ظہور میں آنے سے پہلے انسان کا وہم وگمان بھی ان تک نہ پہنچ سکتا تھا۔

[۳۴] یعنی اس کا علم ہر چیز پر حاوی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ان دو صفات کو بطورِ نمونہ بیان کرنے سے مقصود دراصل یہ ذہن نشین کرنا ہے کہ اگر وہ لوگ شیطان کے دھوکے میں نہ آتے تو یہ سیدھا راستہ انہیں صاف نظر آسکتا تھا کہ آفتاب نامی ایک دہکتا ہوا کرہ جو بیچارہ خود اپنے وجود کا ہوش بھی نہیں رکھتا، کسی عبادت کا مستحق نہیں ہے، بلکہ صرف وہ ہستی اس کا استحقاق رکھتی ہے جو علیم وخبیر ہے اور جس کی قدرت ہر لحظہ نئے نئے کرشمے ظہور میں لا رہی ہے۔

قَالَ سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿٢٧﴾ اِذْهَبْ بِّكِتٰبِيْ
هٰذَا فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُوْنَ ﴿٢٨﴾
قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّيْۤ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ ﴿٢٩﴾ اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ
وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿٣٠﴾ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَاْتُوْنِيْ

سلیمانؑ نے کہا ”ابھی ہم دیکھے لیتے ہیں کہ تو نے سچ کہا ہے یا تو جھوٹ بولنے والوں میں سے ہے۔ میرا یہ خط لے جا اور اسے ان لوگوں کی طرف ڈال دے، پھر الگ ہٹ کر دیکھ کہ وہ کیا ردِ عمل ظاہر کرتے ہیں[٣٦]“

ملکہ بولی[٣٦ الف] ”اے اہل دربار، میری طرف ایک بڑا اہم خط پھینکا گیا ہے۔ وہ سلیمانؑ کی جانب سے ہے اور اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے شروع کیا گیا ہے۔ مضمون یہ ہے کہ ”میرے مقابلے میں سرکشی نہ کرو اور مسلم ہو کر میرے پاس حاضر ہو جاؤ[٣٧]“ ع

[٣٥] اس مقام پر سجدہ واجب ہے۔ یہاں سجدہ کرنے سے مقصود یہ ہے کہ ایک مومن اپنے آپ کو آفتاب پرستوں سے جدا کرے اور اپنے عمل سے اس بات کا اقرار و اظہار کرے کہ وہ آفتاب کو نہیں بلکہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کو اپنا مسجود و معبود مانتا ہے۔

[٣٦] یہاں پہنچ کر ہُد ہُد کا کردار ختم ہوتا ہے۔ عقلیت کے مدعی حضرات نے جس بنا پر اسے پرندہ ماننے سے انکار کیا ہے وہ یہ ہے کہ انہیں ایک پرندے کا اِس قوتِ مشاہدہ، قوتِ تمیز اور قوتِ بیان سے بہرہ ور ہونا بعید از امکان معلوم ہوتا ہے {جو قرآن کے بیانات سے ظاہر ہوتی ہے}۔ لیکن ان حضرات کے پاس آخر وہ کیا سائنٹفک معلومات ہیں جن کی بنا پر وہ قطعیت کے ساتھ کہہ سکتے ہوں کہ حیوانات اور ان کی مختلف انواع اور پھر ان کے مختلف افراد کی قوتیں اور استعدادیں کیا ہیں اور کیا نہیں ہیں۔ انسان کو آج تک کسی یقینی ذریعہ سے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ مختلف قسم کے حیوانات کیا جانتے ہیں، کیا کچھ دیکھتے اور سنتے ہیں، کیا محسوس کرتے ہیں، کیا سوچتے اور سمجھتے ہیں، اور ان میں سے ہر ایک کا ذہن کس طرح کام کرتا ہے۔ پھر بھی جو تھوڑا بہت مشاہدہ مختلف انواع حیوانی کی زندگی کا کیا گیا ہے اس سے ان کی نہایت حیرت انگیز استعدادوں کا پتہ چلا ہے۔ اب اگر اللہ تعالیٰ جو اِن حیوانات کا خالق ہے، ہم کو یہ بتاتا ہے کہ اس نے اپنے ایک نبی کو جانوروں کی منطق سمجھنے اور ان سے کلام کرنے کی قابلیت عطا کی تھی، اور اس نبی کے پاس سدھائے جانے اور تربیت پانے سے ایک ہُد ہُد اس قابل ہو گیا تھا کہ دوسرے ملکوں سے یہ کچھ مشاہدے کر کے آتا اور پیغمبر کو ان کی خبر دیتا تھا، تو بجائے اس کے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے اِس بیان کی روشنی میں حیوانات کے متعلق اپنے آج تک کے تھوڑے سے علم اور بہت سے قیاسات پر نظر ثانی کریں، یہ کیا عقل مندی ہے کہ ہم اپنے ناکافی علم کو معیار قرار دے کر اللہ تعالیٰ کے اس بیان کی تکذیب یا اس کی معنوی تحریف کرنے لگیں۔

{ [٣٦ الف] بیچ کا قصہ چھوڑ کر اب اس وقت کا ذکر ہوتا ہے جب ہدہد نے خط ملکہ کے آگے پھینک دیا۔}

[٣٧] یعنی خط کی اہمیت کئی وجوہ سے ہے۔ ایک یہ کہ وہ عجیب غیر معمولی طریقے سے آیا ہے۔ بجائے اس کے کہ کوئی سفارت اسے لا کر دیتی، ایک پرندے نے اسے لا کر مجھ پر ٹپکا دیا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ فلسطین و شام کے عظیم فرماں روا سلیمانؑ کی جانب سے

ع ۲/۱۷ مُسْلِمِيْنَ ﴿۳۱﴾ ع قَالَتْ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِيْ فِيْٓ اَمْرِيْ ۚ مَا كُنْتُ
قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ ﴿۳۲﴾ قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّاُولُوْا بَاْسٍ
شَدِيْدٍ ۙ وَّالْاَمْرُ اِلَيْكِ فَانْظُرِيْ مَاذَا تَاْمُرِيْنَ ﴿۳۳﴾ قَالَتْ اِنَّ
الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ
وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۴﴾ وَاِنِّيْ مُرْسِلَةٌ اِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ فَنٰظِرَةٌ ۢ بِمَ

(خط سنا کر) ملکہ نے کہا ”اے سردارانِ قوم، میرے اس معاملے میں مجھے مشورہ دو، میں کسی معاملہ کا فیصلہ تمہارے بغیر نہیں کرتی ہوں[۳۸]۔“ اُنہوں نے جواب دیا ”ہم طاقت ور اور لڑنے والے لوگ ہیں۔ آگے فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ خود دیکھ لیں کہ آپ کو کیا حکم دینا ہے۔“ ملکہ نے کہا کہ ”بادشاہ جب کسی ملک میں گھس آتے ہیں تو اسے خراب اور اس کے عزت والوں کو ذلیل کر دیتے ہیں[۳۹]۔ یہی کچھ وہ کیا کرتے ہیں[۴۰]۔ میں اِن لوگوں کی طرف ایک ہدیہ بھیجتی ہوں،

ہے۔ تیسرے یہ کہ اسے اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے شروع کیا گیا ہے، جو ایک غیر معمولی بات ہے۔ ان سب باتوں کے ساتھ یہ امر اس کی اہمیت کو اور زیادہ بڑھا دیتا ہے کہ اس میں بالکل صاف صاف ہم کو یہ دعوت دی گئی ہے کہ ہم سرکشی چھوڑ کر اطاعت اختیار کر لیں اور تابع فرمان بن کر یا مسلمان ہو کر سلیمانؑ کے آگے حاضر ہو جائیں۔

”مسلم“ ہو کر حاضر ہونے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ مطیع بن کر حاضر ہو جاؤ، دوسرے یہ کہ دینِ اسلام قبول کر کے حاضر ہو جاؤ۔ پہلا مفہوم حضرت سلیمانؑ کی شانِ فرماں روائی سے مطابقت رکھتا ہے اور دوسرا مفہوم ان کی شان پیغمبری سے۔

[۳۸] اصل الفاظ ہیں حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ یعنی جب تک کہ تم حاضر نہ ہو، یا تم گواہ نہ ہو۔ اس سے جو بات ظاہر ہوتی ہے وہ یہ کہ قوم سبا میں بادشاہی نظام تو تھا مگر وہ استبدادی نظام نہ تھا، بلکہ فرماں روائے وقت معاملات کے فیصلے اعیان سلطنت کے مشورے سے کرتا تھا۔

[۳۹] اس ایک فقرے میں امپیریلزم اور اس کے اثرات ونتائج پر مکمل تبصرہ کر دیا گیا ہے۔ بادشاہوں کی ملک گیری اور فاتح قوموں کی دوسری قوموں پر دست درازی کبھی اصلاح اور خیر خواہی کے لیے نہیں ہوتی۔ اس کی غرض ہی یہ ہوتی ہے کہ دوسری قوم کو خدا نے جو رزق دیا ہے اور جو وسائل و ذرائع عطا کیے ہیں ان سے وہ خود متمتع ہوں اور اس قوم کو اتنا بے بس کر دیں کہ وہ کبھی ان کے مقابلے میں سر اٹھا کر اپنا حصہ نہ مانگ سکے۔ اس غرض کے لیے وہ اس کی خوش حالی اور طاقت اور عزت کے تمام ذرائع ختم کر دیتے ہیں، اس کے جن لوگوں میں بھی اپنی خودی کا دم داعیہ ہوتا ہے انہیں کچل کر رکھ دیتے ہیں۔

[۴۰] اس فقرے میں دو برابر کے احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ یہ ملکۂ سبا ہی کا قول ہو اور اس نے اپنے پچھلے قول پر بطورِ تاکید اس کا اضافہ کیا ہو۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ کا قول ہو جو ملکہ کے قول کی تائید کے لیے جملۂ معترضہ کے طور پر ارشاد فرمایا گیا ہو۔

يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿٣٥﴾ فَلَمَّا جَآءَ سُلَيْمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ ز
فَمَآ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّآ اٰتٰىكُمْ ج بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ ﴿٣٦﴾
اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَآ
اَذِلَّةً وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿٣٧﴾ قَالَ يٰاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا
قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴿٣٨﴾ قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ

پھر دیکھتی ہوں کہ میرے ایلچی کیا جواب لے کر پلٹتے ہیں۔'' جب وہ (ملکہ کا سفیر) سلیمانؑ کے ہاں پہنچا تو اس نے کہا ''کیا تم لوگ مال سے میری مدد کرنا چاہتے ہو؟ جو کچھ خدا نے مجھے دے رکھا ہے وہ اس سے بہت زیادہ ہے جو تمہیں دیا ہے۔[۴۱] تمہارا ہدیہ تمہی کو مبارک رہے۔ (اے سفیر) واپس جا اپنے بھیجنے والوں کی طرف۔ ہم ان پر ایسے لشکر لے کر آئیں گے[۴۲] جن کا مقابلہ وہ نہ کر سکیں گے اور ہم انہیں ایسی ذلّت کے ساتھ وہاں سے نکالیں گے کہ وہ خوار ہو کر رہ جائیں گے۔''

سلیمانؑ[۴۳] نے کہا ''اے اہلِ دربار، تم میں سے کون اس کا تخت میرے پاس لاتا ہے قبل اس کے کہ وہ لوگ مطیع ہو کر میرے پاس حاضر ہوں؟[۴۴]'' جنوں میں سے ایک قوی ہیکل نے عرض کیا

[۴۱] اس جملے سے مقصود اظہارِ فخر و تکبر نہیں ہے۔ اصل مدعا یہ ہے کہ مجھے تمہارا مال مطلوب نہیں ہے بلکہ تمہارا ایمان مطلوب ہے۔ یا پھر کم سے کم جو چیز میں چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ تم ایک صالح نظام کے تابع ہو جاؤ۔ اگر تم ان دونوں باتوں میں سے کسی کے لیے راضی نہیں ہو تو میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ مال و دولت کی رشوت لے کر تمہیں اس شرک اور اس فاسد نظامِ زندگی کے معاملہ میں آزاد چھوڑ دوں۔ مجھے میرے رب نے جو کچھ دے رکھا ہے وہ اس سے بہت زیادہ ہے کہ میں تمہارے مال کا لالچ کروں۔

[۴۲] پہلے فقرے اور اس فقرے کے درمیان ایک لطیف خلا ہے۔ یعنی پوری بات یوں ہے کہ: اے سفیر، یہ ہدیہ واپس لے جا اپنے بھیجنے والوں کی طرف، انہیں یا تو ہماری پہلی بات ماننی پڑے گی کہ مسلم ہو کر ہمارے پاس حاضر ہو جائیں، ورنہ ہم ان پر لشکر لے کر آئیں گے۔

[۴۳] بیچ میں یہ قصہ چھوڑ دیا گیا ہے کہ سفارت ملکہ کا ہدیہ واپس لے کر پہنچی اور جو کچھ اس نے دیکھا اور سنا تھا وہ عرض کر دیا۔ ملکہ نے اس بنا پر یہی مناسب سمجھا کہ خود ان کی ملاقات کے لیے بیت المقدس جائے۔ چنانچہ وہ خدم و حشم اور شاہی ساز و سامان کے ساتھ سبا سے فلسطین کی طرف روانہ ہوئی اور اس کی اطلاع دربارِ سلیمانی میں بھیج دی۔ اِن تفصیلات کو چھوڑ کر اب اُس وقت کا قصہ بیان کیا جا رہا ہے جب ملکہ بیت المقدس کے قریب پہنچ گئی تھی۔

[۴۴] یعنی وہی تخت جس کے متعلق ہُد ہُد نے بتایا تھا کہ ''اس کا تخت بڑا عظیم الشان ہے۔'' حضرت سلیمان علیہ السلام {یہ تخت منگا کر در اصل} تبلیغ کے ساتھ ساتھ ملکہ اور اس کے درباریوں کو ایک معجزہ بھی دکھانا چاہتے تھے تاکہ اسے معلوم ہو کہ اللہ ربّ العالمین اپنے انبیاء کو کیسی غیر معمولی قدرتیں عطا فرماتا ہے اور اسے یقین آ جائے کہ حضرت سلیمانؑ واقعی اللہ کے نبی ہیں۔

بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ ۚ وَاِنِّیْ عَلَیْهِ لَقَوِیٌّ اَمِیْنٌ ﴿۳۹﴾
قَالَ الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِیْكَ بِهٖ قَبْلَ
اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْكَ طَرْفُكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ
هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ ۫ۖ لِیَبْلُوَنِیْۤ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ؕ وَمَنْ

''میں اسے حاضر کر دوں گا قبل اس کے کہ آپ اپنی جگہ سے اُٹھیں[۴۵]۔ میں اس کی طاقت رکھتا ہوں اور امانت دار ہوں[۴۶]''۔ جس شخص کے پاس کتاب کا ایک علم تھا وہ بولا ''میں آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے اسے لائے دیتا ہوں[۴۷]''۔ جونہی کہ سلیمانؑ نے وہ تخت اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا، وہ پکار اُٹھا ''یہ میرے رب کا فضل ہے تا کہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا کافر نعمت بن جاتا ہوں۔[۴۸]

[۴۵] اس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس جو جن تھے وہ بنی نوع انسان میں سے تھے یا عرفِ عام کے مطابق اُسی پوشیدہ مخلوق میں سے جو جن کے نام سے معروف ہے۔ ظاہر ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے دربار کی نشست زیادہ سے زیادہ تین چار گھنٹے کی ہوگی۔ اور بیت المقدس سے سبا کے پایۂ تخت مارِب کا فاصلہ پرندے کی اڑان کے لحاظ سے بھی کم از کم ڈیڑھ ہزار میل کا تھا۔ اتنے فاصلہ سے ایک ملکہ کا عظیم الشان تخت اتنی کم مدت میں اُٹھالانا کسی انسان کا کام نہیں ہوسکتا تھا، {پھر تخت کہیں جنگل میں رکھا ہوا نہیں تھا بلکہ} ایک ملکہ کے محل میں تھا۔ انسان جا کر اٹھالانا چاہتا تو اس کے ساتھ ایک چھاپہ مار دستہ ہونا چاہیے تھا کہ لڑ بھڑ کر اسے پہرہ داروں سے چھین لائے۔ یہ سب کچھ آخر دربار برخاست ہونے سے پہلے کیسے ہوسکتا تھا۔ اس چیز کا تصور اگر کیا جاسکتا ہے تو ایک حقیقی جن ہی کے بارے میں کیا جاسکتا ہے۔

[۴۶] یعنی آپ مجھ پر یہ بھروسا کر سکتے ہیں کہ میں اسے خود اُڑا نہ لے جاؤں گا، یا اس میں سے کوئی قیمتی چیز نہ چرالوں گا۔

[۴۷] اس شخص کے بارے میں قطعی طور پر یہ معلوم نہیں ہے کہ وہ کون تھا، اور اس کے پاس وہ کس خاص قسم کا علم تھا، اور اس کتاب سے کون سی کتاب مراد ہے جس کا علم اس کے پاس تھا۔ ان امور کی کوئی وضاحت نہ قرآن میں ہے نہ کسی حدیث صحیح میں۔ مفسرین {نے ان کے بارے میں مختلف رائیں ظاہر کی ہیں لیکن ان سب رایوں کی بنیاد محض قیاس پر ہے}۔ ہم صرف اُتنی ہی بات جانتے اور مانتے ہیں جتنی قرآن میں فرمائی گئی ہے، یا جو اس کے الفاظ سے مترشح ہوتی ہے۔ وہ شخص بہر حال جن کی نوع میں سے نہ تھا اور بعید نہیں کہ وہ کوئی انسان ہی ہو۔ اس کے پاس کوئی غیر معمولی علم تھا اور وہ اللہ کی کسی کتاب (الکتاب) سے ماخوذ تھا۔ جن اپنے وجود کی طاقت سے اس تخت کو چند گھنٹوں میں اُٹھالانے کا دعویٰ کر رہا تھا۔ یہ شخص علم کی طاقت سے اس کو ایک لحظہ میں اُٹھالایا۔

[۴۸] قرآن مجید کا اندازِ بیان اس معاملہ میں بالکل صاف ہے کہ اُس دیو ہیکل جن کے دعوے کی طرح اِس شخص کا دعویٰ صرف دعویٰ ہی نہ رہا بلکہ فی الواقع جس وقت اس نے دعویٰ کیا اسی وقت ایک ہی لحظہ میں وہ تخت حضرت سلیمانؑ کے سامنے رکھا نظر آیا۔ ذرا اِن الفاظ پر غور کیجیے:

''اس شخص نے کہا میں آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے اسے لے آتا ہوں۔ جونہی کہ سلیمانؑ نے اسے اپنے پاس رکھا دیکھا۔''

شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ

اور جو کوئی شکر کرتا ہے اس کا شکر اس کے اپنے ہی لیے مفید ہے، ورنہ کوئی ناشکری کرے تو میرا رب بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ بزرگ ہے۔"[۴۹]

جو شخص بھی واقعہ کے عجیب و غریب ہونے کا تصور ذہن سے نکال کر بجائے خود اس عبارت کو پڑھے گا وہ اس سے یہی مفہوم لے گا کہ اس شخص کے یہ کہتے ہی دوسرے لمحہ میں وہ واقعہ پیش آ گیا جس کا اس نے دعویٰ کیا تھا۔ اس سیدھی سی بات کو خواہ مخواہ تاویل کے خراد پر چڑھانے کی کیا ضرورت ہے؟ پھر تخت کو دیکھتے ہی حضرت سلیمانؑ کا یہ کہنا کہ "یہ میرے رب کا فضل ہے تا کہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا کافر نعمت بن جاتا ہوں" اسی صورت میں برمحل ہوسکتا ہے جب کہ یہ کوئی غیر معمولی واقعہ ہو۔ ورنہ اگر واقعہ یہ ہوتا کہ ان کا ایک ہوشیار ملازم ملکہ کے لیے جلدی سے ایک تخت بنالایا یا بنوالایا، تو ظاہر ہے کہ یہ ایسی کوئی نادر بات نہ ہوسکتی تھی کہ اس پر حضرت سلیمانؑ بے اختیار هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ پکار اُٹھتے اور ان کو یہ خطرہ لاحق ہوجاتا کہ اتنے جلدی مہمانِ عزیز کے لیے تخت تیار ہوجانے سے کہیں میں شاکرِ نعمت بننے کے بجائے کافر نعمت نہ بن جاؤں۔ آخر اتنی سی بات پر کسی مومن فرماں روا کو اتنا غرور اور کبرِ نفس لاحق ہوجانے کا کیا خطرہ ہوسکتا ہے، خصوصاً جب کہ وہ ایک معمولی مومن نہ ہو بلکہ اللہ کا نبی ہو۔

اب رہی یہ بات کہ ڈیڑھ ہزار میل سے ایک تختِ شاہی پلک جھپکتے کس طرح اُٹھ کر آ گیا، تو اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ زمان و مکان اور مادّہ و حرکت کے جو تصورات ہم نے اپنے تجربات و مشاہدات کی بنا پر قائم کیے ہیں ان کے جملہ حدود صرف ہم ہی پر منطبق ہوتے ہیں۔ خدا کے لیے نہ یہ تصورات صحیح ہیں اور نہ وہ ان حدود سے محدود ہے۔ اس کی قدرت ایک معمولی تخت تو درکنار، سورج اور اس سے بھی زیادہ بڑے سیاروں کو آن کی آن میں لاکھوں میل کا فاصلہ طے کرا سکتی ہے۔ جس خدا کے صرف ایک حکم سے یہ عظیم کائنات وجود میں آ گئی ہے اس کا ایک ادنیٰ اشارہ ہی ملکۂ سبا کے تخت کو روشنی کی رفتار سے چلا دینے کے لیے کافی تھا۔ آخر اسی قرآن میں یہ ذکر بھی تو موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک رات اپنے بندے محمد ﷺ کو مکہ سے بیت المقدس بھی لے گیا اور واپس بھی لے آیا۔

[۴۹] یعنی وہ کسی کے شکر کا محتاج نہیں ہے۔ اس کی خدائی میں کسی کی شکر گزاری سے نہ ذرّہ برابر کوئی اضافہ ہوتا ہے اور نہ کسی کی ناشکری و احسان فراموشی سے یک سرِمو کوئی کمی آتی ہے۔ وہ آپ اپنے ہی بل بوتے پر خدائی کر رہا ہے، بندوں کے ماننے یا نہ ماننے پر اس کی خدائی منحصر نہیں ہے۔ یہی بات قرآن مجید میں ایک جگہ حضرت موسیٰؑ کی زبان سے نقل کی گئی ہے کہ اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ "اگر تم اور ساری دنیا والے مل کر بھی کفر کریں تو اللہ بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے۔" (ابراہیم۔ آیت ۸) اور یہی مضمون اس حدیث قدسی کا ہے جو صحیح مسلم میں وارد ہوئی ہے کہ:

یقول اللّٰہ تعالیٰ یا عبادی لو انّ اولکم واٰخرکم وانسکم وجنکم کانوا علی اتقی قلب رجل منکم مازاد ذٰلک فی ملکی شیئا یا عبادی لو ان اولکم واٰخرکم وانسکم وجنکم کانوا علی افجر قلب رجل منکم مانقص ذٰلک فی ملکی شیئا یا عبادی انما ھی اعمالکم احصیھا لکم ثم اوفیکم ایاھا فمن وجد خیرا فلیحمد اللّٰہ ومن وجد غیر ذٰلک فلا یلومن الاّ نفسہ۔

"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے میرے بندو، اگر اول سے آخر تک تم سب انس اور جن اپنے سب سے زیادہ متقی شخص کے دل جیسے ہوجاؤ تو اس سے میری بادشاہی میں کوئی اضافہ نہ ہوجائے گا۔ اے میرے بندو، اگر اوّل سے آخر تک تم سب انس اور جن اپنے سب سے زیادہ بدکار شخص کے دل جیسے ہوجاؤ تو میری بادشاہی میں اس سے کوئی کمی نہ ہوجائے گی۔ اے میرے بندو، یہ تمہارے اپنے اعمال ہی

كَرِيمٌ ﴿٤٠﴾ قَالَ نَكِّرُوا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ أَتَهْتَدِي أَمْ تَكُونُ
مِنَ الَّذِينَ لَا يَهْتَدُونَ ﴿٤١﴾ فَلَمَّا جَاءَتْ قِيلَ أَهَكَذَا
عَرْشُكِ قَالَتْ كَأَنَّهُ هُوَ وَأُوتِينَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَكُنَّا

سلیمانؑ[۵۰] نے کہا ''انجان طریقے سے اس کا تخت اس کے سامنے رکھ دو، دیکھیں وہ صحیح بات تک پہنچتی ہے یا اُن لوگوں میں سے ہے جو راہِ راست نہیں پاتے۔[۵۱]'' ملکہ جب حاضر ہوئی تو اس سے کہا گیا کیا تیرا تخت ایسا ہی ہے؟ وہ کہنے لگی ''یہ تو گویا وہی ہے۔[۵۲] ہم تو پہلے ہی جان گئے تھے اور ہم نے سرِ اطاعت جھکا دیا تھا (یا ہم مسلم ہو چکے تھے)۔[۵۳]''

ہیں جن کا میں تمہارے حساب میں شمار کرتا ہوں، پھر ان کی پوری پوری جزا تمہیں دیتا ہوں۔ پس جسے کوئی بھلائی نصیب ہو اسے چاہیے کہ اللہ کا شکر ادا کرے اور جسے کچھ اور نصیب ہو وہ اپنے آپ ہی کو ملامت کرے۔''

[۵۰] بیچ میں یہ تفصیل چھوڑ دی گئی ہے کہ ملکہ کیسے بیت المقدس پہنچی اور کس طرح اس کا استقبال ہوا۔ اسے چھوڑ کر اب اس وقت کا حال بیان کیا جا رہا ہے جب وہ حضرت سلیمانؑ کی ملاقات کے لیے ان کے محل میں پہنچ گئی۔

[۵۱] ذو معنی فقرہ ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی ہے کہ وہ یکا یک اپنے ملک سے اتنی دور اپنا تخت موجود پا کر یہ سمجھ جاتی ہے یا نہیں کہ یہ اسی کا تخت اٹھا لایا گیا ہے۔ اور یہ مطلب بھی ہے کہ وہ اس حیرت انگیز معجزے کو دیکھ کر ہدایت پاتی ہے یا اپنی گمراہی پر قائم رہتی ہے۔
اس سے ان لوگوں کے خیال کی تردید ہو جاتی ہے جو کہتے ہیں کہ حضرت سلیمانؑ اس تخت پر قبضہ کرنے کی نیت رکھتے تھے۔ یہاں وہ خود اس مقصد کا اظہار فرما رہے ہیں کہ انہوں نے یہ کام ملکہ کی ہدایت کے لیے کیا تھا۔

[۵۲] اس سے ان لوگوں کے خیالات کی بھی تردید ہو جاتی ہے جنہوں نے صورتِ واقعہ کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا ہے کہ گویا حضرت سلیمانؑ اپنی مہمان ملکہ کے لیے ایک تخت بنوانا چاہتے تھے، اس غرض کے لیے انہوں نے ٹینڈر طلب کیے، ایک ہٹے کٹے کاریگر نے کچھ زیادہ مدت میں تخت بنا دینے کی پیش کش کی، مگر ایک دوسرے ماہر استاد نے کہا میں ترت پھرت بنائے دیتا ہوں۔ اس سارے نقشے کا تار و پود اس بات سے بکھر جاتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے خود ملکہ ہی کا تخت لانے کے لیے فرمایا تھا (اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا)، اور اس کی آمد پر اپنے ملازموں کو اسی کا تخت انجان طریقے سے اس کے سامنے پیش کرنے کا حکم دیا تھا (نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا)، پھر جب وہ آئی تو اس سے پوچھا گیا کہ کیا تیرا تخت ایسا ہی ہے (اَهٰكَذَا عَرْشُكِ) اور اس نے کہا گویا یہ وہی ہے (كَاَنَّهٗ هُوَ)۔ اس صاف بیان کی موجودگی میں اُن لاطائل تاویلات کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے۔ اس پر بھی کسی کو شک رہے تو بعد کا فقرہ اسے مطمئن کرنے کے لیے کافی ہے۔

[۵۳] یعنی یہ معجزہ دیکھنے سے پہلے ہی سلیمان علیہ السلام کے جو اوصاف اور حالات ہمیں معلوم ہو چکے تھے ان کی بنا پر ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ وہ اللہ کے نبی ہیں، محض ایک سلطنت کے فرماں روا نہیں ہیں۔ تخت کو دیکھنے اور ''گویا یہ وہی ہے'' کہنے کے بعد اس فقرے کا اضافہ کرنے میں آخر کیا معنویت باقی رہ جاتی ہے اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ حضرت سلیمانؑ نے اس کے لیے ایک تخت بنوا کر رکھ دیا تھا؟ بالفرض اگر وہ تخت ملکہ کے تخت سے مشابہ ہی تیار کرا لیا گیا ہو تب بھی اس میں آخر وہ کیا کمال ہو سکتا تھا کہ ایک آفتاب پرست ملکہ اسے دیکھ کر یہ بول اُٹھتی کہ اُوْتِيْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِيْنَ ''ہم کو پہلے ہی علم نصیب ہو گیا تھا اور ہم مسلم ہو چکے تھے۔''

مُسْلِمِيْنَ ﴿۴۲﴾ وَصَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ
اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿۴۳﴾ قِيْلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ ۚ
فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّكَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا ؕ قَالَ
اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ ؕ قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ ۳
وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۴﴾ ع وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ ع ۱۳ ۱۸

اُس کو (ایمان لانے سے) جس چیز نے روک رکھا تھا وہ اُن معبودوں کی عبادت تھی جنہیں وہ اللہ کے سوا پوجتی تھی، کیونکہ وہ ایک کافر قوم سے تھی۔[۵۴] اس سے کہا گیا کہ محل میں داخل ہو۔ اس نے جو دیکھا تو سمجھی کہ پانی کا حوض ہے اور اُترنے کے لیے اس نے اپنے پائینچے اُٹھا لیے۔ سلیمانؑ نے کہا "یہ شیشے کا چکنا فرش ہے۔[۵۵]" اس پر وہ پکار اُٹھی "اے میرے رب (آج تک) میں اپنے نفس پر بڑا ظلم کرتی رہی، اور اب میں نے سلیمانؑ کے ساتھ اللہ ربّ العالمین کی اطاعت قبول کر لی۔[۵۶]" ع

[۵۴] یہ فقرہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی پوزیشن واضح کرنے کے لیے ارشاد ہوا ہے۔ یعنی اس میں ضد اور ہٹ دھرمی نہ تھی۔ وہ اس وقت تک صرف اس لیے کافر تھی کہ کافر قوم میں پیدا ہوئی تھی۔ ہوش سنبھالنے کے بعد سے اس کو جس چیز کے آگے سجدہ ریز ہونے کی عادت پڑی ہوئی تھی، بس وہی اس کے راستے میں ایک رکاوٹ بن گئی تھی۔ حضرت سلیمانؑ سے سابقہ پیش آنے پر جب اس کی آنکھیں کھلیں تو اس رکاوٹ کے ہٹ جانے میں ذرا سی دیر بھی نہ لگی۔

[۵۵] یہ آخری چیز تھی جس نے ملکہ کی آنکھیں کھول دیں۔ پہلی چیز حضرت سلیمانؑ کا وہ خط تھا جو عام بادشاہوں کے طریقے سے ہٹ کر اللہ رحمان و رحیم کے نام سے شروع کیا گیا تھا۔ دوسری چیز اس کے بیش قیمت ہدیوں کو رد کرنا تھا جس سے ملکہ کو اندازہ ہوا کہ یہ بادشاہ کسی اور طرز کا ہے۔ تیسری چیز ملکہ کی سفارت کا بیان تھا جس سے اس کو حضرت سلیمانؑ کی متقیانہ زندگی، ان کی حکمت اور ان کی دعوتِ حق کا علم ہوا۔ اسی چیز نے اسے آمادہ کیا کہ خود چل کر ان سے ملاقات کرے، اور اسی کی طرف اس نے اپنے اس قول میں اشارہ کیا کہ "ہم تو پہلے ہی جان گئے تھے اور ہم مسلم ہو چکے تھے۔" چوتھی چیز اس عظیم الشان تخت کا آناً فاناً مأرب سے بیت المقدس پہنچ جانا تھا جس سے ملکہ کو معلوم ہوا کہ اس شخص کی پشت پر اللہ تعالیٰ کی طاقت ہے۔ اور اب آخری چیز یہ تھی کہ اس نے دیکھا جو شخص یہ سامانِ عیش و تنعم رکھتا ہے اور ایسے شان دار محل میں رہتا ہے وہ کس قدر غرورِ نفس سے پاک ہے، کتنا خدا ترس اور نیک نفس ہے، کس طرح بات بات پر اس کا سر خدا کے آگے شکر گزاری میں جھکا جاتا ہے، اور اس کی زندگی فریفتگانِ حیاتِ دنیا کی زندگی سے کتنی مختلف ہے۔ یہی چیز تھی جس نے اسے وہ کچھ پکار اُٹھنے پر مجبور کر دیا جو آگے اس کی زبان سے نقل کیا گیا ہے۔

[۵۶] حضرت سلیمانؑ اور ملکۂ سبا کا یہ قصہ بائیبل کے عہدِ عتیق و جدید اور روایاتِ یہود، سب میں مختلف طریقوں سے آیا ہے، مگر قرآن کا بیان ان سب سے مختلف ہے۔ عہدِ عتیق میں اس قصے کا خلاصہ یہ ہے:

"اور جب سبا کی ملکہ نے خداوند کے نام کی بابت سلیمان کی شہرت سنی تو وہ آئی تا کہ مشکل سوالوں سے اسے آزمائے۔ اور وہ

بہت بڑی جلو کے ساتھ یروشلم میں آئی...... جب وہ سلیمان کے پاس پہنچی تو اس نے ان سب باتوں کے بارے میں جو اس کے دل میں تھیں اس سے گفتگو کی۔ سلیمان نے ان سب کا جواب دیا...... اور جب سبا کی ملکہ نے سلیمان کی ساری حکمت اور اس محل کو جو اس نے بنایا تھا اور اس کے دستر خوان کی نعمتوں اور اس کے ملازموں کی نشست اور اس کے خادموں کی حاضر باشی اور ان کی پوشاک اور اس کے ساقیوں اور اس سیڑھی کو جس سے وہ خداوند کے گھر کو جاتا تھا دیکھا تو اس کے ہوش اُڑ گئے اور اس نے بادشاہ سے کہا کہ وہ سچی خبر تھی جو میں نے تیرے کاموں اور تیری حکمت کی بابت اپنے ملک میں سنی تھی۔ تو بھی میں نے وہ باتیں باور نہ کیں جب تک خود آ کر اپنی آنکھوں سے دیکھ نہ لیا۔ اور مجھے تو آدھا بھی نہیں بتایا گیا تھا کیونکہ تیری حکمت اور اقبال مندی اُس شہرت سے جو میں نے سنی بہت زیادہ ہے۔ خوش نصیب ہیں تیرے لوگ اور خوش نصیب ہیں تیرے یہ ملازم جو برابر تیرے حضور کھڑے رہتے اور تیری حکمت سنتے ہیں۔ خداوند تیرا خدا مبارک ہو جو تجھ سے ایسا خوشنود ہوا کہ تجھے اسرائیل کے تخت پر بٹھایا...... اور اس نے بادشاہ کو ایک سو بیس قنطار سونا اور مسالے کا بہت بڑا انبار اور بیش بہا جواہر دیے اور جیسے مسالے سبا کی ملکہ نے سلیمان بادشاہ کو دیے ویسے پھر کبھی ایسی بہتات کے ساتھ نہ آئے...... اور سلیمان بادشاہ نے سبا کی ملکہ کو سب کچھ جس کی وہ مشتاق ہوئی اور جو کچھ اس نے مانگا دیا۔ پھر وہ اپنے ملازموں سمیت اپنی مملکت کو لوٹ گئی۔" (سلاطین ۱۰: ۱-۱۳۔ اسی سے ملتا جلتا مضمون ۲۔ تواریخ ۹: ۱-۱۲ میں بھی ہے)

عہدِ جدید میں حضرت عیسیٰؑ کی ایک تقریر کا صرف یہ فقرہ ملکہ ءسبا کے متعلق منقول ہوا ہے:

"دکھن کی ملکہ عدالت کے دن اِس زمانہ کے لوگوں کے ساتھ اُٹھ کر اِن کو مجرم ٹھیرائے گی، کیونکہ وہ دنیا کے کنارے سے سلیمانؑ کی حکمت سننے کو آئی اور دیکھو یہاں وہ ہے جو سلیمان سے بھی بڑا ہے۔" (متی ۱۲: ۴۲۔ لوقا ۱۱: ۳۱)

یہودی ربیوں کی روایات میں حضرت سلیمانؑ اور ملکہ ءسبا کا قصہ اپنی بیشتر تفصیلات میں قرآن سے ملتا جلتا ہے۔ ہُدہُد کا غائب ہونا، پھر آ کر سبا اور اس کی ملکہ کے حالات بیان کرنا، حضرت سلیمانؑ کا اس کے ذریعے سے خط بھیجنا، ہُدہُد کا عین اُس وقت وہ خط ملکہ کے آگے گرانا جب کہ وہ آفتاب کی پرستش کو جارہی تھی، ملکہ کا اس خط کو دیکھ کر اپنے وزراء کی کونسل منعقد کرنا، پھر ملکہ کا ایک قیمتی ہدیہ حضرت سلیمانؑ کے پاس بھیجنا، خود یروشلم پہنچ کر ان سے ملنا، ان کے محل میں پہنچ کر یہ خیال کرنا کہ حضرت سلیمانؑ پانی کے حوض میں بیٹھے ہیں، اور اس میں اترنے کے لیے پائینچے چڑھالینا، یہ سب ان روایات میں اسی طرح مذکور ہے جس طرح قرآن میں بیان ہوا ہے۔ مگر ہدیہ وصول ہونے پر حضرت سلیمانؑ کا جواب، ملکہ کے تخت کو اُٹھوا منگانا، ہر موقع پر ان کا خدا کے آگے جھکنا، اور آخر کار ملکہ کا ان کے ہاتھ پر ایمان لانا، یہ سب باتیں، بلکہ خدا پرستی اور توحید کی ساری باتیں ہی ان روایات میں ناپید ہیں۔ سب سے بڑھ کر غضب یہ ہے کہ ان ظالموں نے حضرت سلیمانؑ پر الزام لگایا ہے کہ انہوں نے ملکہ ءسبا کے ساتھ معاذ اللہ زنا کا ارتکاب کیا اور اسی حرامی نسل سے بابل کا بادشاہ بخت نصرؔ پیدا ہوا جس نے بیت المقدس کو تباہ کیا (جیوش انسائیکلو پیڈیا ج ۱۱۔ صفحہ ۴۴۳)۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ یہودی علماء کا ایک گروہ حضرت سلیمانؑ کا سخت مخالف رہا ہے۔ ان لوگوں نے ان پر توراۃ کے احکام کی خلاف ورزی، غرورِ حکومت، غرورِ عقل ودانش، زن مریدی، عیش پرستی اور شرک وبت پرستی کے گھناؤنے الزامات لگائے ہیں (جیوش انسائیکلو پیڈیا ج ۱۱ ص ۴۳۹-۴۴۱)۔ اور یہ اسی پروپیگنڈے کا اثر ہے کہ بائیبل انہیں نبی کے بجائے محض ایک بادشاہ کی حیثیت سے پیش کرتی ہے اور بادشاہ بھی ایسا جو معاذ اللہ احکامِ الٰہی کے خلاف مشرک عورتوں کے عشق میں گم ہو گیا، جس کا دل خدا سے پھر گیا اور جو خدا کے سوا دوسرے معبودوں کی طرف مائل ہو گیا (۱۔ سلاطین ۱۱: ۱-۱۱)۔ ان چیزوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن نے بنی اسرائیل پر کتنا بڑا احسان کیا ہے کہ ان کے اکابر کا دامن خود ان کی پھینکی ہوئی گندگیوں سے صاف کیا، اور یہ بنی اسرائیل کتنے احسان فراموش ہیں کہ اس پر بھی یہ قرآن اور اس کے لانے والے کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔

اِلٰی ثَمُوۡدَ اَخَاهُمۡ صٰلِحًا اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ فَاِذَا هُمۡ فَرِیۡقٰنِ یَخۡتَصِمُوۡنَ ﴿۴۵﴾ قَالَ یٰقَوۡمِ لِمَ تَسۡتَعۡجِلُوۡنَ بِالسَّیِّئَةِ قَبۡلَ الۡحَسَنَةِ ۚ لَوۡلَا تَسۡتَغۡفِرُوۡنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ﴿۴۶﴾ قَالُوا اطَّیَّرۡنَا بِكَ وَبِمَنۡ مَّعَكَ ؕ قَالَ طٰٓئِرُكُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ بَلۡ

اور [۵۷] ثمود کی طرف ہم نے اُن کے بھائی صالحؑ کو (یہ پیغام دے کر) بھیجا کہ اللہ کی بندگی کرو، تو یکایک وہ دو متخاصم فریق بن گئے۔[۵۸] صالحؑ نے کہا، "اے میری قوم کے لوگو، بھلائی سے پہلے برائی کے لیے کیوں جلدی مچاتے ہو؟[۵۹] کیوں نہیں اللہ سے مغفرت طلب کرتے؟ شاید کہ تم پر رحم فرمایا جائے؟" انہوں نے کہا "ہم نے تو تم کو اور تمہارے ساتھیوں کو بدشگونی کا نشان پایا ہے۔[۶۰]" صالحؑ نے جواب دیا "تمہارے نیک و بدشگون کا سر رشتہ تو اللہ کے پاس ہے۔

[۵۷] تقابل کے لیے ملاحظہ ہو الاعراف، آیات ۷۳ تا ۷۹۔ ہُود، ۶۱ تا ۶۸۔ الشعراء ۱۴۱ تا ۱۵۹۔ القمر، ۲۳ تا ۳۲۔ الشمس، آیات ۱۱-۱۵۔

[۵۸] یعنی جونہی کہ حضرت صالحؑ کی دعوت کا آغاز ہوا، ان کی قوم دو گروہوں میں بٹ گئی۔ ایک گروہ ایمان لانے والوں کا، دوسرا گروہ انکار کرنے والوں کا۔ اور اس تفرقہ کے ساتھ ہی ان کے درمیان کش مکش شروع ہوگئی، جیسا کہ قرآن مجید میں دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے: قَالَ الۡمَلَاُ الَّذِیۡنَ اسۡتَكۡبَرُوۡا مِنۡ قَوۡمِهٖ لِلَّذِیۡنَ اسۡتُضۡعِفُوۡا لِمَنۡ اٰمَنَ مِنۡهُمۡ اَتَعۡلَمُوۡنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرۡسَلٌ مِّنۡ رَّبِّهٖ، قَالُوۡۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرۡسِلَ بِهٖ مُؤۡمِنُوۡنَ ۝ قَالَ الَّذِیۡنَ اسۡتَكۡبَرُوۡۤا اِنَّا بِالَّذِیۡۤ اٰمَنۡتُمۡ بِهٖ كٰفِرُوۡنَ ۝ "اس کی قوم میں سے جو سردار اپنی بڑائی کا گھمنڈ رکھتے تھے انہوں نے اُن لوگوں سے جو کمزور بنا کر رکھے گئے تھے، جو اُن میں سے ایمان لائے تھے، کہا، کیا واقعی تم یہ جانتے ہو کہ صالحؑ اپنے رب کی طرف سے بھیجا گیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا ہم اس چیز پر ایمان رکھتے ہیں جس کو لے کر وہ بھیجے گئے ہیں۔ ان متکبرین نے کہا جس چیز پر تم ایمان لائے ہو اس کے ہم کافر ہیں۔" (الاعراف، آیات ۷۵، ۷۶) یاد رہے کہ ٹھیک یہی صورتِ حال محمد ﷺ کی بعثت کے ساتھ مکہ میں بھی پیدا ہوئی تھی کہ قوم دو حصوں میں بٹ گئی اور اس کے ساتھ ہی ان دونوں گروہوں میں کش مکش شروع ہوگئی۔ اس لیے یہ قصہ آپ سے آپ اُن حالات پر چسپاں ہو رہا تھا جن میں یہ آیات نازل ہوئیں۔

[۵۹] یعنی اللہ سے خیر مانگنے کے بجائے عذاب مانگنے میں کیوں جلدی کرتے ہو؟ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو، سورۃ الاعراف، آیت ۷۷۔

[۶۰] ان کے اس قول کا ایک مطلب یہ ہے کہ تمہاری یہ تحریک ہمارے لیے سخت منحوس ثابت ہوئی ہے، جب سے تم نے اور تمہارے ساتھیوں نے دینِ آبائی کے خلاف یہ بغاوت شروع کی ہے ہم پر آئے دن کوئی نہ کوئی مصیبت نازل ہوتی رہتی ہے۔ اس معنی کے لحاظ سے یہ قول اکثر اُن مشرک قوموں کے اقوال سے مشابہ ہے جو اپنے انبیاء کو منحوس قرار دیتی تھیں۔ {مثال کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ یٰسٓ، آیت: ۱۸ اور سورۃ اعراف، آیت: ۱۳۰}

دوسرا مطلب اس قول کا یہ ہے کہ تمہارے آتے ہی ہماری قوم میں پھوٹ پڑ گئی ہے۔ پہلے ہم ایک قوم تھے جو ایک دین پر مجتمع

اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ ﴿٤٧﴾ وَكَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ﴿٤٨﴾ قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿٤٩﴾ وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٥٠﴾

اصل بات یہ ہے کہ تم لوگوں کی آزمائش ہو رہی ہے۔[٦١]'' اُس شہر میں نو جتھے دار تھے[٦٢] جو ملک میں فساد پھیلاتے اور کوئی اصلاح کا کام نہ کرتے تھے۔ انہوں نے آپس میں کہا'' خدا کی قسم کھا کر عہد کرلو کہ ہم صالحؑ اور اس کے گھر والوں پر شب خون ماریں گے اور پھر اس کے ولی[٦٣] سے کہہ دیں گے کہ ہم اس کے خاندان کی ہلاکت کے موقع پر موجود نہ تھے، ہم بالکل سچ کہتے ہیں۔[٦٤]'' یہ چال تو وہ چلے اور پھر ایک چال ہم نے چلی جس کی انھیں خبر نہ تھی۔[٦٥]

تھی۔ تم ایسے سبز قدم آئے کہ بھائی بھائی کا دشمن ہو گیا اور بیٹا باپ سے کٹ گیا۔ یہی وہ الزام تھا جسے محمد ﷺ کے مخالفین آپ کے خلاف بار بار پیش کرتے تھے۔

[٦١] یعنی بات وہ نہیں ہے جو تم نے سمجھ رکھی ہے۔ اصل معاملہ جسے اب تک تم نہیں سمجھے ہو یہ ہے کہ میرے آنے سے تمہارا امتحان شروع ہو گیا ہے۔ جب تک میں نہ آیا تھا، تم اپنی جہالت میں ایک ڈگر پر چلے جا رہے تھے۔ حق اور باطل کا کوئی کھلا امتیاز سامنے نہ تھا۔ مگر اب ایک کسوٹی آ گئی ہے جس پر تم سب جانچے اور پرکھے جاؤ گے۔ اب حق اور باطل آمنے سامنے موجود ہیں۔ جو حق کو قبول کرے گا وہ بھاری اترے گا۔ اور جو باطل پر جمے گا اس کا وزن رتی بھر بھی نہ رہے گا چاہے وہ آج تک امیر الامراء ہی بنا رہا ہو۔

[٦٢] یعنی ٩ سردارانِ قبائل جن میں سے ہر ایک اپنے ساتھ ایک بڑا جتھا رکھتا تھا۔

[٦٣] یعنی حضرت صالح علیہ السلام کے قبیلے کے سردار سے، جس کو قدیم قبائل رسم و رواج کے مطابق ان کے خون کے دعوے کا حق پہنچتا تھا۔ یہ وہی پوزیشن تھی جو نبی ﷺ کے زمانے میں آپ کے چچا ابو طالب کو حاصل تھی۔ کفارِ قریش بھی اِسی اندیشے سے ہاتھ روکتے تھے کہ اگر وہ آں حضرت ﷺ کو قتل کر دیں گے تو بنی ہاشم کے سردار ابو طالب اپنے قبیلے کی طرف سے خون کا دعویٰ لے کر اٹھیں گے۔

[٦٤] یہ بعینہٖ اُسی نوعیت کی سازش تھی جیسی مکہ کے قبائلی سردار نبی ﷺ کے خلاف سوچتے رہتے تھے، اور بالآخر یہی سازش انہوں نے ہجرت کے موقع پر حضورؐ کو قتل کرنے کے لیے کی۔ یعنی یہ کہ سب قبیلوں کے لوگ مل کر آپ پر حملہ کریں تا کہ بنی ہاشم کسی ایک قبیلے کو ملزم نہ ٹھیرا سکیں اور سب قبیلوں سے بیک وقت لڑنا ان کے لیے ممکن نہ ہو۔

[٦٥] یعنی قبل اس کے کہ وہ اپنے طے شدہ وقت پر حضرت صالحؑ کے ہاں شب خون مارتے، اللہ تعالیٰ نے اپنا عذاب بھیج دیا اور نہ صرف وہ بلکہ ان کی پوری قوم تباہ ہو گئی۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ سازش ان لوگوں نے اونٹنی کی کوچیں کاٹنے کے بعد کی تھی۔ سورۂ ہود میں ذکر آتا ہے کہ جب انہوں نے اُونٹنی کو مار ڈالا تو حضرت صالحؑ نے انہیں نوٹس دیا کہ بس اب تین دن مزے کر لو، اس کے بعد تم پر عذاب آ جائے گا (فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِیْ دَارِکُمْ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ ذٰلِکَ وَعْدٌ غَیْرُ مَکْذُوْبٍ) اس پر شاید انہوں نے سوچا ہو گا کہ صالحؑ کا

فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ۙ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿٥١﴾
فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ
يَّعْلَمُوْنَ ﴿٥٢﴾ وَاَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿٥٣﴾ وَلُوْطًا
اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ﴿٥٤﴾ اَئِنَّكُمْ
لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ

اب دیکھ لو کہ ان کی چال کا انجام کیا ہوا۔ ہم نے تباہ کر کے رکھ دیا اُن کو اور ان کی پوری قوم کو۔ وہ اُن کے گھر خالی پڑے ہیں اُس ظلم کی پاداش میں جو وہ کرتے تھے، اس میں ایک نشانِ عبرت ہے اُن لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں[٦٦]۔ اور بچالیا ہم نے اُن لوگوں کو جو ایمان لائے تھے اور نافرمانی سے پرہیز کرتے تھے۔

اور لوطؑ[٦٧] کو ہم نے بھیجا۔ یاد کرو وہ وقت جب اس نے اپنی قوم سے کہا "کیا تم آنکھوں دیکھتے بدکاری کرتے ہو؟[٦٨] کیا تمہارا یہی چلن ہے کہ عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے پاس شہوت رانی کے لیے جاتے ہو؟ حقیقت یہ ہے کہ تم لوگ

عذابِ موعود تو آئے چاہے نہ آئے ہم لگے ہاتھوں اونٹنی کے ساتھ اس کا بھی کیوں نہ کام تمام کر دیں۔ چنانچہ اغلب یہ ہے کہ انہوں نے شب خون مارنے کے لیے وہی رات تجویز کی ہوگی جس رات عذاب آنا تھا اور قبل اس کے کہ ان کا ہاتھ حضرت صالحؑ پر پڑتا خدا کا زبردست ہاتھ ان پر پڑ گیا۔

[٦٦] یعنی جاہلوں کا معاملہ تو دوسرا ہے۔ وہ تو کہیں گے کہ حضرت صالحؑ اور ان کی اونٹنی کے معاملہ سے اُس زلزلے کا کوئی تعلق نہیں ہے جو قوم ثمود پر آیا، یہ چیزیں تو اپنے طبیعی اسباب سے آیا کرتی ہیں۔ لیکن جو لوگ علم رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ کوئی اندھا بہرا خدا اِس کائنات پر حکومت نہیں کر رہا ہے بلکہ ایک حکیم و دانا ہستی یہاں قسمتوں کے فیصلے کر رہی ہے۔ اس کے فیصلے طبیعی اسباب کے غلام نہیں ہیں بلکہ طبیعی اسباب اس کے ارادے کے غلام ہیں۔ اس کے ہاں قوموں کو گرانے اور اٹھانے کے فیصلے حکمت اور عدل کے ساتھ کیے جاتے ہیں۔ ان حقیقتوں سے جو لوگ باخبر ہیں وہ اُس زلزلے کو اسبابِ طبیعی کا نتیجہ کہہ کر نہیں ٹال سکتے۔ وہ اسے اپنے حق میں تنبیہ کا کوڑا سمجھیں گے اور اس سے عبرت حاصل کریں گے۔

[٦٧] تقابل کے لیے ملاحظہ ہو الاعراف، آیات ٨٠ تا ٨٤۔ ہود، ٧٤ تا ٨٣۔ الحجر، ٥٧ تا ٧٧۔ الانبیاء ٧١ تا ٧٥۔ الشعراء، ١٦٠ تا ١٧٤۔ العنکبوت، ٢٨ تا ٣٥۔ الصافات، ١٣٣ تا ١٣٨۔ القمر ٣٣ تا ٣٩۔

[٦٨] اس ارشاد کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں اور غالباً وہ سب ہی مراد ہیں۔ ایک یہ کہ تم اس فعل کے فحش اور کارِ بد ہونے سے ناواقف نہیں ہو، بلکہ جانتے بوجھتے اس کا ارتکاب کرتے ہو۔ دوسرے یہ کہ تم اس بات سے بھی ناواقف نہیں ہو کہ مرد کی خواہش نفس کے لیے مرد نہیں پیدا کیا گیا بلکہ عورت پیدا کی گئی ہے۔ { تیسرے یہ کہ تم ایک دوسرے کے سامنے بدفعلی کرتے ہو اس کی صراحت آگے سورۂ عنکبوت، آیت ٢٩ میں بھی کی گئی ہے کہ وہ } اپنی مجلسوں میں برا کام کرتے تھے۔

تَجْهَلُوْنَ ﴿۵۵﴾ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْٓا اٰلَ
لُوْطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿۵۶﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ
اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۫ قَدَّرْنٰهَا مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۵۷﴾ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ
مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۵۸﴾ ع قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ ع ۱۴ ۱۹
عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ؕ ءٰٓاللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۵۹﴾

سخت جہالت کا کام کرتے ہو۔[۶۹]" مگر اُس کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انہوں نے کہا" نکال دو لوط کے گھر والوں کو اپنی بستی سے، یہ بڑے پاک باز بنتے ہیں۔" آخر کار ہم نے بچالیا اُس کو اور اُس کے گھر والوں کو، بجز اُس کی بیوی کے جس کا پیچھے رہ جانا ہم نے طے کر دیا تھا،[۷۰] اور برسائی اُن لوگوں پر ایک برسات، بہت ہی بری برسات تھی وہ اُن لوگوں کے حق میں جو متنبہ کیے جا چکے تھے۔ع

(اے نبیؐ)[۷۱] کہو، حمد ہے اللہ کے لیے اور سلام اس کے اُن بندوں پر جنہیں اس نے برگزیدہ کیا۔
(اِن سے پوچھو) اللہ بہتر ہے یا وہ معبود جنہیں یہ لوگ اس کا شریک بنا رہے ہیں؟[۷۲]

[۶۹] جہالت کا لفظ یہاں حماقت اور سفاہت کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اُردو زبان میں بھی ہم گالی گلوچ اور بیہودہ حرکات کرنے والے کو کہتے ہیں کہ وہ جہالت پر اُتر آیا ہے۔ اسی معنی میں یہ لفظ عربی زبان میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا، (الفرقان، آیت ۶۳) لیکن اگر اس لفظ کو بے علمی ہی کے معنی میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم اپنی ان حرکات کے برے انجام کو نہیں جانتے۔ خدا کا عذاب تم پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار کھڑا ہے اور تم ہو کہ انجام سے بے خبر اپنے اس گندے کھیل میں منہمک ہو۔

[۷۰] یعنی پہلے ہی حضرت لوطؑ کو ہدایت کر دی گئی تھی کہ وہ اس عورت کو اپنے ساتھ نہ لے جائیں کیونکہ اسے اپنی قوم کے ساتھ ہی تباہ ہونا ہے۔

[۷۱] یہاں سے دوسرا خطبہ شروع ہوتا ہے اور یہ فقرہ اس کی تمہید ہے۔ اس تمہید سے یہ سبق سکھایا گیا ہے کہ مسلمانوں کو اپنی تقریر کا آغاز کس طرح {اللہ کے حمد اور نیک بندوں پر سلام سے} کرنا چاہیے۔

[۷۲] بظاہر یہ سوال بڑا عجیب معلوم ہوتا ہے کہ اللہ بہتر ہے یا یہ معبودانِ باطل۔ {چناں چہ خود مشرکین بھی} اس غلط فہمی میں مبتلا نہ تھے کہ اللہ کا اور اُن کے معبودوں کا کوئی مقابلہ ہے۔ لیکن یہ سوال ان کے سامنے اس لیے رکھا گیا کہ وہ اپنی غلطی پر متنبہ ہوں۔ {اور محسوس کرلیں کہ جب اللہ ہر حیثیت سے بہتر ہے تو ان کے دین کی کوئی بنیاد نہیں رہ جاتی}، اس لیے کہ پھر یہ بات سراسر نامعقول قرار پاتی تھی کہ بہتر کو چھوڑ کر بدتر کو اختیار کیا جائے۔

اَمَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَاَنۡزَلَ لَكُمۡ مِّنَ
السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَنۡۢبَتۡنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهۡجَةٍ ۚ مَا كَانَ
لَكُمۡ اَنۡ تُنۡۢبِتُوۡا شَجَرَهَا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلۡ هُمۡ قَوۡمٌ
يَّعۡدِلُوۡنَ ؕ﴿۶۰﴾ اَمَّنۡ جَعَلَ الۡاَرۡضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَاۤ اَنۡهٰرًا

الجزء ۲۰

بھلا وہ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تمہارے لیے آسمان سے پانی برسایا پھر اس کے ذریعہ سے وہ خوش نما باغ اُگائے جن کے درختوں کا اُگانا تمہارے بس میں نہ تھا؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا خدا بھی (اِن کاموں میں شریک) ہے[۷۳]؟ (نہیں)، بلکہ یہی لوگ راہِ راست سے ہٹ کر چلے جا رہے ہیں۔

اور وہ کون ہے جس نے زمین کو جائے قرار[۷۴] بنایا اور اس کے اندر دریا رواں کیے

[۷۳] مشرکوں میں سے کوئی بھی اس سوال کا یہ جواب نہ دے سکتا تھا کہ یہ کام اللہ کے سوا کسی اور کے ہیں، یا اللہ کے ساتھ کوئی اور بھی ان میں شریک ہے۔ قرآن مجید نے مختلف مقامات پر کفارِ مکہ اور مشرکین عرب { کا یہ اعتراف اور عقیدہ نقل کیا ہے کہ ''وہ اللہ ہی ہے جس نے زمین اور آسمان کو پیدا کیا ہے۔'' (زخرف، آیت ۹) ''جس نے خود انھیں بھی وجود بخشا ہے۔'' زخرف، آیت ۸۷) ''جس نے آسمان سے پانی برسایا اور مردہ پڑی ہوئی زمین کو جلا اُٹھایا'' (العنکبوت، آیت ۶۳)۔ ''اور جو} اس نظامِ عالم کی تدبیر کر رہا ہے'' (یونس، آیت ۳۱)۔ عرب کے مشرکین ہی نہیں، دنیا بھر کے مشرکین بالعموم یہی مانتے تھے اور آج بھی مانتے ہیں کہ کائنات کا خالق اور نظامِ کائنات کا مدبر اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اس لیے قرآن مجید کے اس سوال کا یہ جواب اُن میں سے کوئی شخص ہٹ دھرمی کی بنا پر برائے بحث بھی نہ دے سکتا تھا کہ ہمارے معبود خدا کے ساتھ اِن کاموں میں شریک ہیں۔

اس سوال اور اس کے بعد کے سوالات میں صرف مشرکین ہی کے شرک کا ابطال نہیں ہے بلکہ دہریوں کی دہریت کا ابطال بھی ہے۔ مثلاً اِسی پہلے سوال میں پوچھا گیا ہے کہ یہ بارش برسانے والا اور اس کے ذریعے سے ہر طرح کی نباتات اُگانے والا کون ہے؟ اب غور کیجیے، زمین میں اُس مواد کا ٹھیک سطح پر یا سطح سے متصل موجود ہونا جو بے شمار مختلف اقسام کی نباتی زندگی کے لیے درکار ہے، اور پانی کے اندر ٹھیک وہ اوصاف موجود ہونا جو حیوانی اور نباتی زندگی کی ضروریات کے مطابق ہیں، اور اس پانی کا پے در پے سمندروں سے اُٹھایا جانا اور زمین کے مختلف حصوں میں وقتاً فوقتاً ایک باقاعدگی کے ساتھ برسایا جانا، اور زمین، ہوا، پانی اور درجۂ حرارت وغیرہ مختلف قوتوں کے درمیان ایسا متناسب تعاون قائم کرنا کہ اس سے نباتی زندگی کو نشوونما نصیب ہو اور وہ ہر طرح کی حیوانی زندگی کے لیے اس کی بے شمار ضروریات پوری کرے، کیا یہ سب کچھ ایک حکیم کی منصوبہ بندی اور دانش مندانہ تدبیر اور غالب قدرت و ارادہ کے بغیر خود بخود اتفاقاً ہو سکتا ہے؟ اور کیا یہ ممکن ہے کہ یہ اتفاقی حادثہ مسلسل ہزارہا برس بلکہ لاکھوں کروڑوں برس تک اسی باقاعدگی سے رونما ہوتا چلا جائے؟ صرف ایک ہٹ دھرم آدمی ہی، جو تعصب میں اندھا ہو چکا ہو، اسے ایک امرِ اتفاقی کہہ سکتا ہے۔ کسی راستی پسند عاقل انسان کے لیے ایسا لغو دعویٰ کرنا اور ماننا ممکن نہیں ہے۔

[۷۴] زمین کا اپنی بے حد و حساب مختلف النوع آبادی کے لیے جائے قرار ہونا بھی کوئی سادہ سی بات نہیں ہے۔ اس کرۂ خاکی کو جن حکیمانہ مناسبتوں کے ساتھ قائم کیا گیا ہے، ان کی تفصیلات پر آدمی غور کرے تو اس کی عقل دنگ رہ جاتی ہے اور اسے محسوس ہوتا ہے کہ

وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ءَاِلٰهٌ مَّعَ
اللّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۱﴾ اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا
دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ

اور اس میں (پہاڑوں کی) میخیں گاڑ دیں اور پانی کے دو ذخیروں کے درمیان پردے حائل کر دیے[۷۵]؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی (ان کاموں میں شریک) ہے؟ نہیں، بلکہ ان میں سے اکثر لوگ نادان ہیں۔ کون ہے جو بے قرار کی دُعا سنتا ہے جب کہ وہ اُسے پکارے اور کون اس کی تکلیف رفع کرتا ہے[۷۶]؟ اور (کون ہے جو) تمہیں زمین کا خلیفہ بناتا ہے[۷۷]؟

یہ مناسبتیں ایک حکیم و دانا قادرِ مطلق کی تدبیر کے بغیر قائم نہ ہو سکتی تھیں۔ یہ کرہ فضائے بسیط میں معلق ہے، مگر اس کے باوجود اس میں کوئی اضطراب اور اہتزاز نہیں ہے۔ اگر اس میں ذرا سا بھی اہتزاز ہوتا، تو یہاں کوئی آبادی ممکن نہ تھی۔ یہ کرہ باقاعدگی کے ساتھ سورج کے سامنے آتا اور چھپتا ہے، جس سے رات اور دن کا اختلاف رونما ہوتا ہے۔ اگر اس کا ایک ہی رُخ ہر وقت سورج کے سامنے رہتا اور دوسرا رُخ ہر وقت چھپا رہتا تو یہاں کوئی آبادی ممکن نہ ہوتی۔ اس کرہ پر پانچ سو میل کی بلندی تک ہوا کا ایک کثیف رڈا چڑھا دیا گیا ہے جو شہابوں کی خوف ناک بم باری سے اسے بچائے ہوئے ہے۔ ورنہ روزانہ دو کروڑ شہاب، جو ۳۰ میل فی سکنڈ کی رفتار سے زمین کی طرف گرتے ہیں، یہاں وہ تباہی مچاتے کہ کوئی انسان، حیوان یا درخت جیتا نہ رہ سکتا تھا۔ یہی ہوا درجۂ حرارت کو قابو میں رکھتی ہے، یہی سمندروں سے بادل اٹھاتی ہے اور زمین کے مختلف حصوں تک آب رسانی کی خدمت انجام دیتی ہے اور یہی انسان اور حیوان اور نباتات کی زندگی کو مطلوبہ گیسیں فراہم کرتی ہے۔ یہ نہ ہوتی تب بھی زمین کسی آبادی کے لیے جائے قرار نہ بن سکتی۔ اس کرے کو سورج سے ایک خاص فاصلے پر رکھا گیا ہے جو آبادی کے لیے مناسب ترین ہے۔ اگر اس کا فاصلہ زیادہ ہوتا تو سورج سے اس کو حرارت کم ملتی، سردی بہت زیادہ ہوتی، موسم بہت لمبے ہوتے، اور مشکل ہی سے یہ آبادی کے قابل ہوتا۔ اور اگر فاصلہ کم ہوتا تو اس کے برعکس گرمی کی زیادتی اور دوسری بہت سی چیزیں مل جل کر اسے انسان جیسی مخلوق کی سکونت کے قابل نہ رہنے دیتیں۔

یہ صرف چند وہ مناسبتیں ہیں جن کی بدولت زمین اپنی موجودہ آبادی کے لیے جائے قرار بنی ہے۔ کوئی شخص عقل رکھتا ہو اور ان امور کو نگاہ میں رکھ کر سوچے تو وہ ایک لمحہ کے لیے بھی نہ یہ تصور کر سکتا ہے کہ کسی خالق حکیم کی منصوبہ سازی کے بغیر یہ مناسبتیں محض ایک حادثہ کے نتیجے میں خود بخود قائم ہو گئی ہیں، اور نہ یہ گمان کر سکتا ہے کہ اس عظیم الشان تخلیقی منصوبے کو بنانے اور روبعمل لانے میں کسی دیوی دیوتا، یا جن، یا نبی وولی، یا فرشتے کا کوئی دخل ہے۔

[۷۵] یعنی میٹھے اور کھاری پانی کے ذخیرے، جو اسی زمین پر موجود ہیں، مگر باہم خلط ملط نہیں ہوتے۔ زیرِ زمین پانی کی سوتیں بسا اوقات ایک ہی علاقے میں کھاری پانی الگ اور میٹھا پانی الگ لے کر چلتی ہیں۔ کھاری پانی کے سمندر تک میں بعض مقامات پر میٹھے پانی کے چشمے رواں ہوتے ہیں اور ان کی دھار سمندر کے پانی سے الگ ہوتی ہے۔ (تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو، سورۃ الفرقان، حاشیہ ۶۸)

[۷۶] مشرکین عرب خود اس بات کو جانتے اور مانتے تھے کہ مصیبت کو ٹالنے والا حقیقت میں اللہ ہی ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو الانعام، حواشی ۲۹-۴۱۔ یونس، آیات ۲۱-۲۲۔ حاشیہ ۳۱۔ النحل، حاشیہ ۴۶۔ بنی اسرائیل حاشیہ ۸۴)

[۷۷] اس کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ ایک نسل کے بعد دوسری نسل اور ایک قوم کے بعد دوسری قوم اٹھاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ تم کو زمین میں تصرف اور فرماں روائی کے اختیارات عطا کرتا ہے۔

مَّعَ اللّٰهِ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۶۲﴾ اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ
الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ؕ
ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۳﴾ اَمَّنْ يَّبْدَؤُا
الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ

کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی (یہ کام کرنے والا) ہے؟ تم لوگ کم ہی سوچتے ہو۔
اور وہ کون ہے جو خشکی اور سمندر کی تاریکیوں میں تم کو راستہ دکھاتا ہے[۷۸] اور کون اپنی رحمت کے آگے ہواؤں کو خوش خبری لے کر بھیجتا ہے[۷۹]؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا خدا بھی (یہ کام کرتا) ہے؟ بہت بالا و برتر ہے اللہ اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔
اور وہ کون ہے جو خلق کی ابتدا کرتا اور پھر اس کا اعادہ کرتا ہے[۸۰]؟ اور کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے[۸۱]؟

[۷۸] یعنی جس نے ستاروں کے ذریعہ سے ایسا انتظام کر دیا ہے کہ تم رات کے اندھیرے میں بھی اپنا راستہ تلاش کر سکتے ہو۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی حکیمانہ تدبیروں میں سے ایک ہے کہ اس نے بحری اور برّی سفروں میں انسان کی رہنمائی کے لیے وہ ذرائع پیدا کر دیے ہیں جن سے وہ اپنی سمتِ سفر، اور منزلِ مقصود کی طرف اپنی راہ متعین کرتا ہے۔

[۷۹] رحمت سے مراد ہے بارش جس کے آنے سے پہلے ہوائیں اس کی آمد آمد کی خبر دے دیتی ہیں۔

[۸۰] یہ سادہ سی بات جس کو ایک جملے میں بیان کر دیا گیا ہے اپنے اندر ایسی تفصیلات رکھتی ہے کہ آدمی ان کی گہرائی میں جتنی دور تک اُترتا جاتا ہے اتنے ہی وجودِ الٰہ اور وحدتِ الٰہ کے شواہد اسے ملتے چلے جاتے ہیں۔ پہلے تو بجائے خود تخلیق ہی کو دیکھیے۔ انسان کا علم آج تک یہ راز نہیں پا سکا ہے کہ زندگی کیسے اور کہاں سے آتی ہے۔ اِس وقت تک مسلّم سائنٹفک حقیقت یہی ہے کہ بے جان مادّے کی محض ترکیب سے خود بخود جان پیدا نہیں ہو سکتی۔ {سائنس کی ساری تجرباتی اور تحقیقی کاوشوں کے باوجود} زندگی اب بھی بجائے خود ایک معجزہ ہی ہے، جس کی کوئی علمی توجیہ اس کے سوا نہیں کی جا سکی ہے کہ یہ ایک خالق کے امر و ارادہ اور منصوبے کا نتیجہ ہے۔

اس کے بعد آگے دیکھیے۔ زندگی محض ایک مجرد صورت میں نہیں بلکہ بے شمار متنوّع صورتوں میں پائی جاتی ہے۔ اس وقت تک روئے زمین پر حیوانات کی تقریباً ۱۰ لاکھ اور نباتات کی تقریباً دو لاکھ انواع کا پتہ چلا ہے۔ یہ لکھوکھا انواع اپنی ساخت اور نوعی خصوصیات میں ایک دوسرے سے ایسا واضح اور قطعی امتیاز رکھتی ہیں، اور قدیم ترین معلوم زمانے سے اپنی اپنی صورتِ نوعیہ کو اس طرح مسلسل برقرار رکھتی چلی آ رہی ہیں کہ ایک خدا کے تخلیقی منصوبے (Design) کے سوا زندگی کے اس عظیم تنوع کی کوئی اور معقول توجیہ کر دینا کسی ڈارون کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس وقت تک یہ حقیقت اپنی جگہ بالکل اٹل ہے کہ ایک صانع حکیم، ایک خالق البارئ المصور ہی نے زندگی کو یہ لاکھوں متنوع صورتیں عطا کی ہیں۔

یہ تو ہے ابتدائے خلق کا معاملہ۔ اب ذرا اعادۂ خلق پر غور کیجیے۔ خالق نے ہر نوع حیوانی اور نباتی کی ساخت و ترکیب میں وہ حیرت انگیز نظام العمل (Mechanism) رکھ دیا ہے جو اس کے بے شمار افراد میں سے بے حد و حساب نسل ٹھیک اسی کی صورتِ نوعیہ اور مزاج و

ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۶۴﴾
قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ؕ

کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی (ان کاموں میں حصہ دار) ہے؟ کہو کہ لاؤ اپنی دلیل اگر تم سچے ہو۔[۸۲]
اِن سے کہو، اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین میں کوئی غیب کا علم نہیں رکھتا۔[۸۳]

خصوصیات کے ساتھ نکالتا چلا جاتا ہے اور کبھی جھوٹوں بھی ان کروڑ ہا کروڑ چھوٹے چھوٹے کارخانوں میں یہ بھول چوک نہیں ہوتی کہ ایک نوع کا کوئی کارخانۂ تناسل کسی دوسری نوع کا ایک نمونہ نکال کر پھینک دے۔ اگر کوئی شخص توالدُ وتناسل کے اُس خورد بینی تخم کو دیکھے جو تمام نوعی امتیازات اور موروثی خصوصیات کو اپنے ذرا سے وجود کے بھی محض ایک حصے میں لیے ہوئے ہوتا ہے، اور پھر اس انتہائی نازک اور پیچیدہ عضوی نظام اور بے انتہا لطیف و پر پیچ عملیات (Progresses) کو دیکھے جن کی مدد سے ہر نوع کے ہر فرد کا تخم تناسل اُسی نوع کا فرد وجود میں لاتا ہے، تو وہ اک لمحہ کے لیے بھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ ایسا نازک اور پیچیدہ نظام العمل کبھی خود بخود بن سکتا ہے اور پھر مختلف انواع کے اربوں ملین افراد میں آپ سے آپ ٹھیک چلتا بھی رہ سکتا ہے۔ یہ چیز نہ صرف اپنی ابتدا کے لیے ایک صانع حکیم چاہتی ہے، بلکہ ہر آن اپنے درست طریقہ پر چلتے رہنے کے لیے بھی ایک ناظم و مدبر اور ایک حیّ و قیوم کی طالب ہے جو ایک لحظہ کے لیے بھی ان کارخانوں کی نگرانی و رہنمائی سے غافل نہ ہو۔

یہ حقائق ایک دہریے کے انکارِ خدا کی بھی اسی طرح جڑ کاٹ دیتے ہیں جس طرح ایک مشرک کے شرک کی۔ کون احمق یہ گمان کر سکتا ہے کہ خدائی کے اس کام میں کوئی فرشتہ یا جن یا نبی یا ولی ذرہ برابر بھی کوئی حصہ رکھتا ہے۔ اور کون صاحب عقل آدمی تعصب سے پاک ہو کر یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ سارا کارخانۂ خلق و اعادۂ خلق اِس کمال حکمت و نظم کے ساتھ اتفاقاً شروع ہوا اور آپ سے آپ چلے جا رہا ہے۔

[۸۱] رزق دینے کا معاملہ بھی یہ ہے کہ اس زمین پر لاکھوں انواع حیوانات کی اور لاکھوں ہی نباتات کی پائی جاتی ہیں جن میں سے ہر ایک کے اربوں افراد موجود ہیں، اور ہر ایک کی غذائی ضروریات الگ ہیں۔ خالق نے ان میں سے ہر نوع کی غذا کا سامان اِس کثرت سے اور ہر ایک کی دست رس کے اِس قدر قریب فراہم کیا ہے کہ کسی نوع کے افراد بھی یہاں غذا پانے سے محروم نہیں رہ جاتے۔ پھر اس انتظام میں زمین اور آسمان کی اتنی مختلف قوتیں مل جل کر کام کرتی ہیں جن کا شمار مشکل ہے۔

کون شخص تصور کر سکتا ہے کہ یہ حکیمانہ انتظام ایک مدبر کی تدبیر اور سوچے سمجھے منصوبے کے بغیر یونہی اتفاقاً ہو سکتا تھا؟ یا اس انتظام میں کسی جن یا فرشتے یا کسی بزرگ کی روح کا کوئی دخل ہے؟

[۸۲] یعنی یا تو اس بات پر دلیل لاؤ کہ ان کاموں میں واقعی کوئی اور بھی شریک ہے، یا نہیں تو پھر کسی معقول دلیل سے یہی بات سمجھا دو کہ یہ سارے کام تو ہوں صرف ایک اللہ کے مگر بندگی و عبادت کا حق پہنچے اُس کے سوا کسی اور کو، یا اس کے ساتھ کسی اور کو بھی۔

[۸۳] اوپر تخلیق، تدبیر اور رزّاقی کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے الٰہ واحد (یعنی اکیلے خدا اور اکیلے مستحق عبادت) ہونے پر استدلال کیا گیا تھا۔ اب خدائی کی ایک اور اہم صفت، یعنی علم کے لحاظ سے بتایا جا رہا ہے کہ اس میں بھی اللہ تعالیٰ لاشریک ہے۔

غیب کے معنی مخفی، پوشیدہ اور مستور کے ہیں۔ اصطلاحاً اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جو معلوم نہ ہو، جس تک ذرائع معلومات کی رسائی نہ ہو۔ دنیا میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو فرداً فرداً بعض انسانوں کے علم میں ہیں اور بعض کے علم میں نہیں ہیں۔ اور بہت سی چیزیں ایسی

ہیں جو بحیثیت مجموعی پوری نوعِ انسانی کے علم میں نہ کبھی تھیں، نہ آج ہیں، نہ آئندہ کبھی آئیں گی۔ ایسا ہی معاملہ جنوں اور فرشتوں اور دوسری مخلوقات کا بھی۔ یہ تمام اقسام کے غیب صرف ایک ذات پر روشن ہیں، اور وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اس کے لیے کوئی چیز غیب نہیں، سب شہادت ہی شہادت ہے۔

اس حقیقت کو بیان کرنے میں سوال کا وہ طریقہ اختیار نہیں کیا گیا جو اوپر تخلیق وتدبیر کائنات اور رزّاقی کے بیان میں اختیار کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن صفات کے آثار تو بالکل نمایاں ہیں جنہیں ہر شخص دیکھ رہا ہے، اور ان کے بارے میں کفار ومشرکین تک یہ مانتے تھے اور مانتے ہیں کہ یہ سارے کام اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں۔ لیکن علم کی صفت اپنے کوئی محسوس آثار نہیں رکھتی جن کی طرف اشارہ کیا جاسکے۔ یہ معاملہ صرف غور وفکر ہی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ اس لیے اس کو سوال کے بجائے دعوے کے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

الُوہیت اور علم غیب کے درمیان ایک ایسا گہرا تعلق ہے کہ قدیم ترین زمانے سے انسان نے جس ہستی میں بھی خدائی کے کسی شائبے کا گمان کیا ہے اُس کے متعلق یہ خیال ضرور کیا ہے کہ اس پر سب کچھ روشن ہے اور کوئی چیز اس سے پوشیدہ نہیں ہے۔ گویا انسان کا ذہن اِس حقیقت سے بالکل بدیہی طور پر آگاہ ہے کہ قسمتوں کا بنانا اور بگاڑنا، دعاؤں کا سننا، حاجتیں پوری کرنا صرف اُسی ہستی کا کام ہوسکتا ہے جو سب کچھ جانتی ہو اور جس سے کچھ بھی پوشیدہ نہ ہو۔ اب اگر یہ حقیقت ہے کہ خالق اور مدبر اور مجیب الدعوات اور رازق خدا کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہے، جیسا کہ اوپر کی آیات میں ثابت کیا گیا ہے، تو آپ سے آپ یہ بھی حقیقت ہے کہ عالم الغیب بھی خدا کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہے۔

پھر یہ صفت قابل تجزیہ بھی نہیں ہے کہ کوئی بندہ مثلاً صرف زمین کی حد تک، اور زمین میں بھی صرف انسانوں کی حد تک عالم الغیب ہو۔ یہ اُسی طرح قابلِ تجزیہ نہیں ہے جس طرح خدا کی خلاقی ورزّاقی اور قیومی و پروردگاری قابلِ تجزیہ نہیں ہے۔ ابتدائے آفرینش سے آج تک جتنے انسان دنیا میں پیدا ہوئے ہیں اور قیامت تک پیدا ہوں گے، رحم مادر میں استقرار کے وقت سے آخری ساعتِ حیات تک ان سب کے تمام حالات وکیفیات کو جاننا آخر کس بندے کا کام ہوسکتا ہے؟ اور وہ کیسے اور کیوں اس کو جانے گا؟ {جب کہ وہ نہ ان کا خالق ہے، نہ رازق ہے، نہ تقدیر ساز ہے}۔

اسی بنا پر یہ اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے کہ عالم الغیب اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے اور جس قدر چاہے اپنی معلومات کا کوئی گوشہ کھول دے، اور کسی غیب یا بعض غیوب کو اس پر روشن کردے، لیکن علمِ غیب بحیثیت مجموعی کسی کو نصیب نہیں اور عالم الغیب ہونے کی صفت صرف اللہ ربّ العالمین کے لیے مخصوص ہے۔ (ملاحظہ ہو الانعام، آیت ۵۹۔ سورۂ لقمان، آیت ۳۴۔ سورۂ بقرہ، آیت ۲۵۵)

قرآن مجید مخلوقات کے لیے علم غیب کی اس عام اور مطلق نفی پر ہی اکتفا نہیں کرتا بلکہ خاص طور پر انبیاء علیہم السلام، اور خود محمد ﷺ کے بارے میں اس امر کی صاف صاف تصریح کرتا ہے کہ وہ عالم الغیب نہیں ہیں اور اُن کو غیب کا صرف اُتنا علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیا گیا ہے جو رسالت کی خدمت انجام دینے کے لیے درکار تھا۔

سورۂ انعام، آیت ۵۰۔ الاعراف، آیت ۱۸۷۔ التوبہ، آیت ۱۰۱۔ ہود، آیت ۳۱۔ احزاب، آیت ۶۳۔ الاحقاف، آیت ۹۔ التحریم، آیت ۳، اور الجن، آیات ۲۶ تا ۲۸ اِس معاملہ میں کسی اشتباہ کی گنجائش نہیں چھوڑتیں۔

وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴿٦٥﴾ بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِى
ع ٨ الْاٰخِرَةِ قف بَلْ هُمْ فِىْ شَكٍّ مِّنْهَا قف بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ ﴿٦٦﴾ ع
وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّاٰبَآؤُنَآ اَئِنَّا
لَمُخْرَجُوْنَ ﴿٦٧﴾ لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا مِنْ

اور وہ (تمہارے معبود تو یہ بھی) نہیں جانتے کہ کب وہ اُٹھائے جائیں گے۔[٨٤] بلکہ آخرت کا تو علم ہی اِن لوگوں سے گم ہوگیا ہے، بلکہ یہ اس کی طرف سے شک میں ہیں، بلکہ یہ اُس سے اندھے ہیں۔[٨٥] ع یہ منکرین کہتے ہیں ''کیا جب ہم اور ہمارے باپ دادا مٹی ہو چکے ہوں گے تو ہمیں واقعی قبروں سے نکالا جائے گا؟ یہ خبریں ہم کو بھی بہت دی گئی ہیں اور پہلے ہمارے آباؤ اجداد کو بھی دی جاتی رہی ہیں،

[٨٤] یعنی دوسرے، جن کے متعلق یہ گمان کیا جاتا ہے کہ وہ عالم الغیب ہیں، اور اسی بنا پر جن کو تم لوگوں نے خدائی میں شریک ٹھیرا لیا ہے، اُن بیچاروں کو تو خود اپنے مستقبل کی بھی خبر نہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ کب قیامت کی وہ گھڑی آئے گی جب اللہ تعالیٰ اُن کو دوبارہ اُٹھا کھڑا کرے گا۔

[٨٥] الوہیت کے بارے میں ان لوگوں کی بنیادی غلطیوں پر متنبہ کرنے کے بعد اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ یہ لوگ ان شدید گمراہیوں میں پڑے ہوئے ہیں اس کی اصل وجہ یہ نہیں ہے کہ غور وفکر کرنے کے بعد یہ کسی دلیل و برہان سے اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ خدائی میں درحقیقت کچھ دوسری ہستیاں اللہ تعالیٰ کو شریک ہیں۔ بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ انہوں نے کبھی سنجیدگی کے ساتھ غور وفکر ہی نہیں کیا ہے۔ چونکہ یہ لوگ آخرت سے بے خبر ہیں، یا اس کی طرف سے شک میں ہیں، یا اس سے اندھے بنے ہوئے ہیں، اس لیے فکرِ عقبیٰ سے بے نیازی نے ان کے اندر سراسر ایک غیر ذمہ دارانہ رویہ پیدا کر دیا ہے۔ یہ کائنات اور خود اپنی زندگی کے حقیقی مسائل کے بارے میں سرے سے کوئی سنجیدگی رکھتے ہی نہیں۔

اِن کو اس کی پرواہی نہیں ہے کہ حقیقت کیا ہے اور اِن کا فلسفۂ حیات اُس حقیقت سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک آخرِ کار مشرک اور دہریے اور موحد اور مشکک سب کو مر کر مٹی ہو جانا ہے اور کسی چیز کا بھی کوئی نتیجہ نکلنا نہیں ہے۔

آخرت کا یہ مضمون اس سے پہلے کی آیت کے اِس فقرے سے نکلا ہے کہ ''وہ نہیں جانتے کہ کب وہ اُٹھائے جائیں گے۔'' اُس فقرے میں تو یہ بتایا گیا تھا کہ جن کو معبود بنایا جاتا ہے ــــ اور ان میں فرشتے، جنّ، انبیاء، اور اولیاء سب شامل تھے ــــ ان میں سے کوئی بھی آخرت کے وقت سے واقف نہیں ہے کہ وہ کب آئے گی۔ اس کے بعد اب عام مشرکین و کفار کے بارے میں تین باتیں ارشاد ہوئی ہیں۔ اوّل یہ کہ وہ سرے سے یہی نہیں جانتے کہ آخرت کبھی ہوگی بھی یا نہیں۔ دوسرے یہ کہ ان کی یہ بے خبری اس بنا پر نہیں ہے کہ انہیں اس کی اطلاع ہی کبھی نہ دی گئی ہو، بلکہ اس بنا پر ہے کہ جو خبر انہیں دی گئی اس پر انہوں نے یقین نہیں کیا بلکہ اس کی صحت میں شک کرنے لگے۔ تیسرے یہ کہ انہوں نے کبھی غور و خوض کر کے اُن دلائل کو جانچنے کی زحمت ہی نہیں اٹھائی جو آخرت کے وقوع کے بارے میں پیش کیے گئے، بلکہ اس کی طرف سے اندھے بن کر رہنے ہی کو انہوں نے ترجیح دی۔

قَبْلُ ۙ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۶۸﴾ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۶۹﴾

مگر یہ بس افسانے ہی افسانے ہیں جو اگلے وقتوں سے سنتے چلے آ رہے ہیں۔" کہو ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ مجرموں کا کیا انجام ہو چکا ہے۔[۸۶]

[۸۶] اس مختصر سے فقرے میں آخرت کی دو زبردست دلیلیں بھی ہیں اور نصیحت بھی۔

پہلی دلیل یہ ہے کہ دنیا کی جن قوموں نے بھی آخرت کو نظر انداز کیا ہے وہ مجرم بنے بغیر نہیں رہ سکی ہیں۔ وہ غیر ذمہ دار بن کر رہیں۔ انہوں نے ظلم وستم ڈھائے۔ وہ فسق و فجور میں غرق ہوگئیں۔ اور اخلاق کی تباہی نے آخر کار ان کو برباد کر کے چھوڑا۔ یہ تاریخ انسانی کا مسلسل تجربہ، جس پر زمین میں ہر طرف تباہ شدہ قوموں کے آثار شہادت دے رہے ہیں، صاف ظاہر کرتا ہے کہ آخرت کے ماننے اور نہ ماننے کا نہایت گہرا تعلق انسانی رویے کی صحت اور عدم صحت سے ہے۔ اس کو مانا جائے تو رویہ درست رہتا ہے۔ نہ مانا جائے تو رویہ غلط ہو جاتا ہے۔ یہ اس امر کی صریح دلیل ہے کہ اس کا ماننا حقیقت کے مطابق ہے، اسی لیے اس کے ماننے سے انسانی زندگی ٹھیک ڈگر پر چلتی ہے۔ اور اس کا نہ ماننا حقیقت کے خلاف ہے، اسی وجہ سے یہ گاڑی پٹڑی سے اتر جاتی ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ تاریخ کے اس طویل تجربے میں مجرم بن جانے والی قوموں کا مسلسل تباہ ہونا اس حقیقت پر صاف دلالت کر رہا ہے کہ یہ کائنات بے شعور طاقتوں کی اندھی بہری فرماں روائی نہیں ہے، بلکہ یہ ایک حکیمانہ نظام ہے جس کے اندر ایک اٹل قانونِ مکافات کام کر رہا ہے۔ جس کی حکومت انسانی قوموں کے ساتھ سراسر اخلاقی بنیادوں پر معاملہ کر رہی ہے۔ جس میں کسی قوم کو بدکرداریوں کی کھلی چھوٹ نہیں دی جاتی کہ ایک دفعہ عروج پا جانے کے بعد وہ ابدالآباد تک دادِ عیش دیتی رہے اور ظلم وستم کے ڈنکے بجائے چلی جائے۔ بلکہ ایک خاص حد کو پہنچ کر ایک زبردست ہاتھ آگے بڑھتا ہے اور اس کو بامِ عروج سے گرا کر قعرِ مذلت میں پھینک دیتا ہے۔ اس حقیقت کو جو شخص سمجھ لے وہ کبھی اس امر میں شک نہیں کر سکتا کہ یہی قانونِ مکافات اِس دنیوی زندگی کے بعد ایک دوسرے عالم کا تقاضا کرتا ہے جہاں افراد کا اور قوموں کا اور بحیثیت مجموعی پوری نوع انسانی کا انصاف چکایا جائے۔ کیونکہ محض ایک ظالم قوم کے تباہ ہو جانے سے تو انصاف کے سارے تقاضے پورے نہیں ہو گئے۔ اس سے اُن مظلوموں کی تو کوئی دادرسی نہیں ہوئی جن کی لاشوں پر انہوں نے اپنی عظمت کا قصر بنایا تھا۔ اس سے ان ظالموں کو تو کوئی سزا نہیں ملی جو تباہی کے آنے سے پہلے مزے اڑا کر جا چکے تھے۔ اس سے ان بدکاروں پر بھی کوئی مؤاخذہ نہیں ہوا جو پشت در پشت اپنے بعد آنے والی نسلوں کے لیے گمراہیوں اور بداخلاقیوں کی میراث چھوڑتے چلے گئے تھے۔ دنیا میں عذاب بھیج کر تو صرف اُن کی آخری نسل کے مزید ظلم کا سلسلہ توڑ دیا گیا۔ ابھی عدالت کا اصل کام تو ہوا ہی نہیں کہ ہر ظالم کو اس کے کیے کا بدلہ دیا جائے اور ہر مظلوم کے نقصان کی تلافی کی جائے، اور اُن سب لوگوں کو انعام دیا جائے جو بدی کے اِس طوفان میں راستی پر قائم اور اصلاح کے لیے کوشاں رہے اور عمر بھر اس راہ میں اذیتیں سہتے رہے۔ یہ سب لازماً کسی وقت ہونا چاہیے، کیونکہ دنیا میں قانونِ مکافات کی مسلسل کارفرمائی کائنات کی فرماں روا حکومت کا یہ مزاج اور طریقۂ کار صاف بتا رہی ہے کہ وہ انسانی اعمال کو ان کی اخلاقی قدر کے لحاظ سے تولتی اور ان کی جزا اور سزا دیتی ہے۔

ان دو دلیلوں کے ساتھ اس آیت میں نصیحت کا پہلو یہ ہے کہ پچھلے مجرموں کا انجام دیکھ کر اس سے سبق لو اور انکارِ آخرت کے اُسی احمقانہ عقیدے پر اصرار نہ کیے چلے جاؤ جس نے اُنہیں مجرم بنا کر چھوڑا تھا۔

وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُنْ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ ﴿٧٠﴾
وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿٧١﴾ قُلْ
عَسَىٰ أَن يَكُونَ رَدِفَ لَكُم بَعْضُ الَّذِي تَسْتَعْجِلُونَ ﴿٧٢﴾
وَإِنَّ رَبَّكَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا
يَشْكُرُونَ ﴿٧٣﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُورُهُمْ

اے نبیؐ، اِن کے حال پر رنج نہ کرو اور نہ اِن کی چالوں پر دل تنگ ہو۔[۸۷] وہ کہتے ہیں کہ ''یہ دھمکی کب پوری ہوگی اگر تم سچے ہو[۸۸]؟'' کہو کیا عجب کہ جس عذاب کے لیے تم جلدی مچا رہے ہو اس کا ایک حصہ تمہارے قریب ہی آ لگا ہو۔[۸۹] حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب تو لوگوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔[۹۰] بلا شبہ تیرا رب خوب جانتا ہے جو کچھ ان کے سینے اپنے اندر چھپائے ہوئے ہیں

[۸۷] یعنی تم نے سمجھانے کا حق ادا کر دیا۔ اب اگر یہ نہیں مانتے اور اپنی حماقت پر اصرار کر کے عذابِ الٰہی کے مستحق بننا ہی چاہتے ہیں تو تم خواہ مخواہ ان کے حال پر کُڑھ کُڑھ کر اپنی جان کیوں ہلکان کرو۔ پھر یہ حقیقت و صداقت سے لڑنے اور تمہاری اصلاحی کوششوں کو نیچا دکھانے کے لیے جو گھٹیا درجے کی چالیں چل رہے ہیں اُن پر کبیدہ خاطر ہونے کی تمہیں کیا ضرورت ہے۔ تمہاری پشت پر خدا کی طاقت ہے۔ یہ تمہاری بات نہ مانیں گے تو اپنا ہی کچھ بگاڑیں گے۔ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

[۸۸] اس سے مراد وہی دھمکی ہے جو اوپر کی آیت میں پوشیدہ ہے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ اس فقرے میں ہماری خبر لینے کی جو درپردہ دھمکی دی جارہی ہے یہ آخر کب عمل میں لائی جائے گی؟ ہم تو تمہاری بات رد بھی کر چکے ہیں اور تمہیں نیچا دکھانے کے لیے اپنی تدبیروں میں بھی ہم نے کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی ہے۔ اب کیوں ہماری خبر نہیں لی جاتی؟

[۸۹] یہ شاہانہ کلام کا انداز ہے۔ قادرِ مطلق کے کلام میں جب ''شاید'' اور ''کیا عجب'' اور ''کیا بعید ہے'' جیسے الفاظ آتے ہیں تو ان میں شک کا کوئی مفہوم نہیں ہوتا بلکہ ان سے شان بے نیازی کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کی قدرت ایسی غالب ہے کہ اس کا کسی چیز کو چاہنا اور اس چیز کا ہو جانا گویا ایک ہی بات ہے۔ اس کے بارے میں یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کوئی کام کرنا چاہے اور وہ نہ ہو سکے۔ اس لیے اس کا یہ فرمانا کہ ''کیا عجب ایسا ہو'' یہ معنی رکھتا ہے کہ ایسا ہو کر رہے گا اگر تم سیدھے نہ ہوئے۔ ایک معمولی تھانہ دار بھی اگر بستی کے کسی شخص سے کہہ دے کہ تمہاری شامت پکار رہی ہے تو اسے رات کو نیند نہیں آتی۔ کجا کہ قادرِ مطلق کسی سے کہہ دے کہ تمہارا برا وقت کچھ دور نہیں ہے اور پھر وہ بے خوف رہے۔

[۹۰] یعنی یہ تو اللہ ربّ العالمین کی عنایت ہے کہ وہ لوگوں کو قصور سرزد ہوتے ہی نہیں پکڑ لیتا بلکہ سنبھلنے کی مہلت دیتا ہے۔ مگر اکثر لوگ اس پر شکر گزار ہو کر اس مہلت کو اپنی اصلاح کے لیے استعمال نہیں کرتے بلکہ مواخذہ میں دیر ہونے کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ یہاں کوئی گرفت کرنے والا نہیں ہے اس لیے جو جی میں آئے کرتے رہو اور کسی سمجھانے والے کی بات مان کر نہ دو۔

وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿٧٤﴾ وَمَا مِنْ غَآئِبَةٍ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ
اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿٧٥﴾ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى
بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿٧٦﴾
وَاِنَّهٗ لَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٧٧﴾ اِنَّ رَبَّكَ

اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں۔[۹۱] آسمان وزمین کی کوئی پوشیدہ چیز ایسی نہیں ہے جو ایک واضح کتاب میں لکھی ہوئی موجود نہ ہو۔[۹۲] یہ واقعہ ہے کہ یہ قرآن بنی اسرائیل کو اکثر اُن باتوں کی حقیقت بتاتا ہے جن میں وہ اختلاف رکھتے ہیں[۹۳] اور یہ ہدایت اور رحمت ہے ایمان لانے والوں کے لیے۔[۹۴]

[۹۱] یعنی وہ اِن کی علانیہ حرکات ہی سے واقف نہیں ہے بلکہ جو شدید بغض اور کینہ ان کے سینوں میں چھپا ہوا ہے اور جو چالیں یہ اپنے دلوں میں سوچتے ہیں، ان سے بھی وہ خوب واقف ہے۔ اس لیے جب ان کی شامت آنے کا وقت آن پہنچے گا تو کوئی چیز چھوڑی نہیں جائے گی جس پر ان کی خبر نہ لی جائے۔ یہ اندازِ بیان اسی طرح کا ہے جیسے ایک حاکم اپنے علاقے کے کسی بدمعاش سے کہے، مجھے تیرے سب کرتوتوں کی خبر ہے۔ اس کا صرف یہی مطلب نہیں ہوتا کہ وہ اپنے باخبر ہونے کی اسے اطلاع دے رہا ہے، بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ تو اپنی حرکتوں سے باز آجا، ورنہ یاد رکھ کہ جب پکڑا جائے گا تو تیرے ایک ایک جرم کی پوری سزا دی جائے گی۔

[۹۲] یہاں کتاب سے مراد قرآن نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کا وہ ریکارڈ ہے جس میں ذرّہ ذرّہ ثبت ہے۔

[۹۳] اس فقرے کا تعلق مضمون سابق سے بھی ہے اور مضمون مابعد سے بھی۔ مضمون سابق سے اس کا تعلق یہ ہے کہ اسی عالم الغیب خدا کے علم کا ایک کرشمہ یہ ہے کہ ایک اُمّی کی زبان سے اس قرآن میں اُن واقعات کی حقیقت کھولی جارہی ہے جو بنی اسرائیل کی تاریخ میں گزرے ہیں، حالانکہ خود علمائے بنی اسرائیل کے درمیان ان کی اپنی تاریخ کے ان واقعات میں اختلاف ہے (اس کے نظائر اسی سورۂ نمل کے ابتدائی رکوعوں میں گزر چکے ہیں جیسا کہ ہم نے اپنے حواشی میں واضح کیا ہے)۔ اور مضمونِ مابعد سے اس کا تعلق یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اُن اختلافات کا فیصلہ فرمایا ہے اسی طرح وہ اُس اختلاف کا بھی فیصلہ کردے گا جو محمد ﷺ اور ان کے مخالفین کے درمیان برپا ہے۔ وہ کھول کر رکھ دے گا کہ دونوں میں سے حق پر کون ہے اور باطل پر کون۔ چنانچہ ان آیات کے نزول پر چند ہی سال گزرے تھے کہ فیصلہ ساری دنیا کے سامنے آ گیا۔ اُسی عرب کی سرزمین میں، اور اسی قبیلۂ قریش میں ایک متنفس بھی ایسا نہ رہا جو اس بات کا قائل نہ ہو گیا ہو کہ حق پر محمد ﷺ تھے نہ کہ ابو جہل اور ابولہب۔ ان لوگوں کی اپنی اولاد تک مان گئی کہ ان کے باپ غلطی پر تھے۔

[۹۴] یعنی اُن لوگوں کے لیے جو اس قرآن کی دعوت قبول کرلیں اور وہ بات مان لیں جسے یہ پیش کررہا ہے۔ ایسے لوگ اُن گمراہیوں سے بچ جائیں گے جن میں ان کی قوم مبتلا ہے۔ ان کو اس قرآن کی بدولت زندگی کا سیدھا راستہ مل جائے گا اور ان پر خدا کی وہ مہربانیاں ہوں گی جن کا تصور بھی کفارِ قریش آج نہیں کرسکتے۔ اس رحمت کی بارش کو بھی چند ہی سال بعد دنیا نے دیکھ لیا کہ وہی لوگ جو ریگ زارِ عرب کے ایک گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے تھے اور کفر کی حالت میں زیادہ سے زیدہ ایک کامیاب چھاپہ مار بن سکتے تھے، اس قرآن پر ایمان لانے کے بعد یکایک وہ دنیا کے پیشوا، قوموں کے امام، تہذیب انسانی کے استاد اور روئے زمین کے ایک بڑے حصے پر فرماں روا ہو گئے۔

يَقْضِىْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ﴿۷۸﴾
فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِيْنِ ﴿۷۹﴾
اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا
مُدْبِرِيْنَ ﴿۸۰﴾ وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِى الْعُمْىِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ؕ
اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۸۱﴾
وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ
الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ ۙ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ ﴿۸۲﴾ ع ۶

یقیناً (اسی طرح) تیرا رب اِن لوگوں کے درمیان[۹۵] بھی اپنے حکم سے فیصلہ کردے گا اور وہ زبردست اور سب کچھ جاننے والا ہے۔[۹۶] پس اے نبیؐ، اللہ پر بھروسا رکھو، یقیناً تم صریح حق پر ہو۔ تم مردوں کو نہیں سنا سکتے،[۹۷] نہ اُن بہروں تک اپنی پکار پہنچا سکتے ہو جو پیٹھ پھیر کر بھاگے جا رہے ہوں،[۹۸] اور نہ اندھوں کو راستہ بتا کر بھٹکنے سے بچا سکتے ہو۔[۹۹] تم تو اپنی بات انہی لوگوں کو سنا سکتے ہو جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں اور پھر فرماں بردار بن جاتے ہیں۔ اور جب ہماری بات پوری ہونے کا وقت اُن پر آ پہنچے[۱۰۰] گا تو ہم ان کے لیے ایک جانور زمین سے نکالیں گے جو ان سے کلام کرے گا کہ لوگ ہماری آیات پر یقین نہیں کرتے تھے۔[۱۰۱] ع

[۹۵] یعنی قریش کے کفار اور اہل ایمان کے درمیان۔

[۹۶] یعنی نہ اس کے فیصلے کو نافذ ہونے سے کوئی طاقت روک سکتی ہے۔ اور نہ اس کے فیصلے میں غلطی کا کوئی احتمال ہے۔

[۹۷] یعنی ایسے لوگوں کو جن کے ضمیر مر چکے ہیں اور جن میں ضد اور ہٹ دھرمی اور رسم پرستی نے حق و باطل کا فرق سمجھنے کی کوئی صلاحیت باقی نہیں چھوڑی ہے۔

[۹۸] یعنی جو تمہاری بات کے لیے صرف اپنے کان بند کر لینے پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ اُس جگہ سے کترا کر نکل جاتے ہیں جہاں انہیں اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں تمہاری بات ان کے کان میں نہ پڑ جائے۔

[۹۹] یعنی اِن کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی انہیں سیدھے راستے پر کھینچ لانا اور گھسیٹ کر لے چلنا تو تمہارا کام نہیں ہے۔ تم تو صرف زبان اور اپنی مثال ہی سے بتا سکتے ہو کہ یہ سیدھا راستہ ہے اور وہ راستہ غلط ہے جس پر یہ لوگ چل رہے ہیں۔ مگر جس نے اپنی آنکھیں بند کر لی ہوں اور جو دیکھنا ہی نہ چاہتا ہو اس کی رہنمائی تم کیسے کر سکتے ہو۔

[۱۰۰] یعنی قیامت قریب آ جائے گی جس کا وعدہ ان سے کیا جا رہا ہے۔

[۱۰۱] ابن عمرؓ کا قول ہے کہ یہ اس وقت ہو گا جب زمین میں کوئی نیکی کا حکم کرنے والا اور بدی سے روکنے والا باقی نہ رہے گا۔ ابن مردویہ نے ایک حدیث ابو سعید خدریؓ سے نقل کی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ یہی بات انہوں نے خود حضورؐ سے سنی تھی۔ اس سے

وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُّكَذِّبُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿۸۳﴾ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْ قَالَ اَكَذَّبْتُمْ بِاٰيٰتِىْ

اور ذرا تصور کرو اُس دن کا جب ہم ہر اُمت میں سے ایک فوج لوگوں کی گھیر لائیں گے جو ہماری آیات کو جھٹلایا کرتے تھے، پھر ان کو (ان کی اقسام کے لحاظ سے درجہ بدرجہ) مرتب کیا جائے گا۔ یہاں تک کہ جب سب آجائیں گے، تو (ان کا رب ان سے) پوچھے گا کہ ''تم نے میری آیات کو جھٹلا دیا

معلوم ہوا کہ جب انسان امر بالمعروف اور نہی عن المنکر چھوڑ دیں گے تو قیامت قائم ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ ایک جانور کے ذریعے سے آخری مرتبہ حجت قائم فرمائے گا۔ یہ بات واضح نہیں ہے کہ یہ ایک ہی جانور ہوگا یا ایک خاص قسم کی جنس حیوان ہوگی جس کے بہت سے افراد روئے زمین پر پھیل جائیں گے۔ دَابَّةٌ مِّنَ الْاَرْضِ کے الفاظ میں دونوں معنوں کا احتمال ہے۔ بہر حال جو بات وہ کہے گا وہ یہ ہوگی کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی ان آیات پر یقین نہیں کرتے تھے جن میں قیامت کے آنے اور آخرت برپا ہونے کی خبریں دی گئی تھیں، تو لو اب اس کا وقت آن پہنچا ہے اور جان لو کہ اللہ کی آیات سچی تھیں۔ یہ فقرہ کہ ''لوگ ہماری آیات پر یقین نہیں کرتے تھے'' یا تو اس جانور کے اپنے کلام کی نقل ہے، یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے کلام کی حکایت۔ اگر یہ اُسی کے الفاظ کی نقل ہے تو ''ہماری'' کا لفظ وہ اُسی طرح استعمال کرے گا جس طرح ایک حکومت کا ہر کارندہ ''ہم'' کا لفظ اس معنی میں بولتا ہے کہ وہ اپنی حکومت کی طرف سے بات کر رہا ہے نہ کہ اپنی شخصی حیثیت میں۔ دوسری صورت میں بات صاف ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے کلام کو چونکہ اپنے الفاظ میں بیان فرما رہا ہے اس لیے اس نے ہماری آیات'' کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔

اس جانور کے نکلنے کا وقت کون سا ہوگا؟ اس کے متعلق نبی ﷺ کا ارشاد یہ ہے کہ ''آفتاب مغرب سے طلوع ہوگا اور ایک روز دن دہاڑے یہ جانور نکل آئے گا۔ ان میں سے جو نشانی بھی پہلے ہو وہ بہر حال دوسری کے قریب ہی ظاہر ہوگی۔'' (مسلم) دوسری روایات جو مسلم، ابن ماجہ، ترمذی اور مسند احمد وغیرہ میں آئی ہیں، ان میں حضورؐ نے بتایا ہے کہ قیامت کے قریب زمانے میں دجال کا خروج، دابۃ الارض کا ظہور، دُخان (دھواں)، اور آفتاب کا مغرب سے طلوع وہ نشانیاں ہیں جو یکے بعد دیگرے ظاہر ہوں گی۔

اس جانور کی ماہیت، شکل وصورت، نکلنے کی جگہ، اور ایسی ہی دوسری تفصیلات کے متعلق طرح طرح کی روایات نقل کی گئی ہیں جو باہم بہت مختلف اور متضاد ہیں۔ ان چیزوں کے ذکر سے بجز ذہن کی پراگندگی کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا، اور ان کے جاننے کا کوئی فائدہ بھی نہیں کیونکہ جس مقصد کے لیے قرآن میں یہ ذکر کیا گیا ہے اس سے ان تفصیلات کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

رہا کسی جانور کا انسانوں سے انسانی زبان میں کلام کرنا، تو یہ اللہ کی قدرت کا ایک کرشمہ ہے۔ وہ جس چیز کو چاہے نطق کی طاقت بخش سکتا ہے۔ قیامت سے پہلے تو وہ ایک جانور ہی کو نطق بخشے گا۔ مگر جب وہ قیامت قائم ہو جائے گی تو اللہ کی عدالت میں انسان کی آنکھ اور کان اور اس کے جسم کی کھال تک بول اٹھے گی، جیسا کہ قرآن میں بتصریح بیان ہوا ہے حَتّٰٓى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ...... وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِىْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَىْءٍ (حٰم السجدہ: ۲۰، ۲۱)

وَلَمْ تُحِيطُوا بِهَا عِلْمًا أَمَّاذَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۸۴﴾ وَوَقَعَ
الْقَوْلُ عَلَيْهِم بِمَا ظَلَمُوا فَهُمْ لَا يَنطِقُونَ ﴿۸۵﴾ أَلَمْ يَرَوْا
أَنَّا جَعَلْنَا اللَّيْلَ لِيَسْكُنُوا فِيهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۚ
إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿۸۶﴾ وَيَوْمَ يُنفَخُ
فِي الصُّورِ فَفَزِعَ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَمَن فِي الْأَرْضِ

حالانکہ تم نے ان کا علمی احاطہ نہ کیا تھا؟[۱۰۲] اگر یہ نہیں تو اور تم کیا کر رہے تھے؟[۱۰۳]'' اور ان کے ظلم کی وجہ سے عذاب کا وعدہ ان پر پورا ہو جائے گا، تب وہ کچھ بھی نہ بول سکیں گے۔ کیا ان کو سجھائی نہ دیتا تھا کہ ہم نے رات ان کے لیے سکون حاصل کرنے کو بنائی تھی اور دن کو روشن کیا تھا؟[۱۰۴] اس میں بہت نشانیاں تھیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے تھے۔[۱۰۵]

اور کیا گزرے گی اس روز جب کہ صور پھونکا جائے گا اور ہول کھا جائیں گے وہ سب جو آسمانوں اور زمین میں ہیں۔[۱۰۶]

[۱۰۲] یعنی تمہارے جھٹلانے کی وجہ یہ ہرگز نہیں تھی کہ کسی علمی ذریعہ سے تحقیق کر کے تمہیں معلوم ہو گیا تھا کہ یہ آیات جھوٹی ہیں۔ تم نے تحقیق اور غور و فکر کے بغیر بس یوں ہی ہماری آیات کو جھٹلا دیا؟

[۱۰۳] یعنی اگر ایسا نہیں ہے تو کیا تم یہ ثابت کر سکتے ہو کہ تم نے تحقیق کے بعد ان آیات کو جھوٹا ہی پایا تھا اور تمہیں واقعی یہ علم حاصل ہو گیا تھا کہ حقیقت نفس الامری وہ نہیں ہے جو ان آیات میں بیان کی گئی ہے؟

[۱۰۴] یعنی بے شمار نشانیوں میں سے یہ دو نشانیاں تو ایسی تھیں جن کا وہ سب ہر وقت مشاہدہ کر رہے تھے، جن کے فوائد سے ہر آن متمتع ہو رہے تھے، جو کسی اندھے بہرے اور گونگے تک سے چھپی ہوئی نہ تھیں۔ کیوں نہ رات کے آرام اور دن کے مواقع سے فائدہ اٹھاتے وقت انہوں نے کبھی سوچا کہ یہ ایک حکیم کا بنایا ہوا نظام ہے جس نے ٹھیک ٹھیک ان کی ضروریات کے مطابق زمین اور سورج کا تعلق قائم کیا ہے۔ یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس میں مقصدیت، حکمت اور منصوبہ بندی علانیہ نظر آ رہی ہے جو اندھے قوائے فطرت کی صفت نہیں ہو سکتی۔ اور یہ بہت سے خداؤں کی کارفرمائی بھی نہیں ہے، کیونکہ یہ نظام لامحالہ کسی ایک ہی ایسے خالق و مالک اور مدبر کا قائم کیا ہوا ہو سکتا ہے جو زمین، چاند، سورج اور تمام دوسرے سیاروں پر فرماں روائی کر رہا ہو۔ صرف اسی ایک چیز کو دیکھ کر وہ جان سکتے تھے کہ ہم نے اپنے رسول اور اپنی کتاب کے ذریعے سے جو حقیقت بتائی ہے یہ رات اور دن کی گردش اس کی تصدیق کر رہی ہے۔

[۱۰۵] یعنی یہ کوئی نہ سمجھ میں آ سکنے والی بات بھی نہیں تھی۔ آخر انہی کے بھائی بند، انہی کے قبیلے اور برادری کے لوگ، انہی جیسے انسان ایسے موجود تھے جو یہی نشانیاں دیکھ کر مان گئے تھے کہ نبی جس خدا پرستی اور توحید کی طرف بلا رہا ہے وہ بالکل مطابقِ حقیقت ہے۔

[۱۰۶] نفخ صور پر مفصل بحث کے لیے ملاحظہ ہو، سورۂ انعام، حاشیہ ۴۷۔ ابراہیم، حاشیہ ۵۷۔ سورۂ طٰہٰ، حاشیہ ۷۸۔ سورۂ حج، حاشیہ ۱۔ یٰسین، حواشی ۴۶، ۴۷۔ الزمر، حاشیہ ۷۹۔

اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَ كُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِیْنَ ﴿۸۷﴾ وَ تَرَى الْجِبَالَ
تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّ هِیَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ؕ صُنْعَ اللّٰهِ
الَّذِیْۤ اَتْقَنَ كُلَّ شَیْءٍ ؕ اِنَّهٗ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۸۸﴾
مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَیْرٌ مِّنْهَا ۚ وَ هُمْ مِّنْ فَزَعٍ یَّوْمَئِذٍ
اٰمِنُوْنَ ﴿۸۹﴾ وَ مَنْ جَآءَ بِالسَّیِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِی النَّارِ ؕ هَلْ

سوائے اُن لوگوں کے جنھیں اللہ اس ہول سے بچانا چاہے گا۔ اور سب کان دبائے اس کے حضور حاضر ہو جائیں گے۔ آج تو پہاڑوں کو دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ خوب جمے ہوئے ہیں، مگر اُس وقت یہ بادلوں کی طرح اُڑ رہے ہوں گے، یہ اللہ کی قدرت کا کرشمہ ہوگا جس نے ہر چیز کو حکمت کے ساتھ استوار کیا ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ تم لوگ کیا کرتے ہو۔[۱۰۷] جو شخص بھلائی لے کر آئے گا اسے اُس سے زیادہ بہتر صلہ ملے گا[۱۰۸] اور ایسے لوگ اُس دن کے ہول سے محفوظ ہوں گے،[۱۰۹] اور جو برائی لیے ہوئے آئے گا، ایسے سب لوگ اوندھے منہ آگ میں پھینکے جائیں گے۔

[۱۰۷] یعنی ایسے خدا سے تم یہ توقع نہ رکھو کہ اپنی دنیا میں تم کو عقل و تمیز اور تصرف کے اختیارات دے کر وہ تمہارے اعمال و افعال سے بے خبر رہے گا اور یہ نہ دیکھے گا کہ اس کی زمین میں تم ان اختیارات کو کیسے استعمال کرتے رہے ہو۔

[۱۰۸] یعنی وہ اس لحاظ سے بھی بہتر ہوگا کہ جتنی نیکی اس نے کی ہوگی اس سے زیادہ انعام اسے دیا جائے گا۔ اور اس لحاظ سے بھی کہ اس کی نیکی تو وقتی تھی اور اس کے اثرات بھی دنیا میں ایک محدود زمانے کے لیے تھے، مگر اس کا اجر دائمی اور ابدی ہوگا۔

[۱۰۹] یعنی قیامت اور حشر و نشر کی وہ ہولناکیاں جو منکرینِ حق کے حواس باختہ کیے دے رہی ہوں گی، ان کے درمیان یہ لوگ مطمئن ہوں گے۔ اس لیے کہ یہ سب کچھ ان کی توقعات کے مطابق ہوگا۔ وہ پہلے سے اللہ اور اس کے رسولوں کی دی ہوئی خبروں کے مطابق اچھی طرح جانتے تھے کہ قیامت قائم ہونی ہے، ایک دوسری زندگی پیش آنی ہے اور اس میں یہی سب کچھ ہونا ہے۔ اس لیے ان پر وہ بدحواسی اور گھبراہٹ طاری نہ ہوگی جو مرتے دم تک اس چیز کا انکار کرنے والوں اور اس سے غافل رہنے والوں پر طاری ہوگی۔ پھر ان کے اطمینان کی وجہ یہ بھی ہوگی کہ انہوں نے اس دن کی توقع پر اس کے لیے فکر کی تھی اور یہاں کی کامیابی کے لیے کچھ سامان کر کے دنیا سے آئے تھے۔ اس لیے اُن پر وہ گھبراہٹ طاری نہ ہوگی جو ان لوگوں پر طاری ہوگی جنہوں نے اپنا سارا سرمایۂ حیات دنیا ہی کی کامیابیاں حاصل کرنے پر لگا دیا تھا اور کبھی نہ سوچا تھا کہ کوئی آخرت بھی ہے جس کے لیے کچھ سامان کرنا ہے۔ منکرین کے برعکس یہ مومنین اب مطمئن ہوں گے کہ جس دن کے لیے ہم نے ناجائز فائدوں اور لذتوں کو چھوڑا تھا، اور صعوبتیں اور مشقتیں برداشت کی تھیں، وہ دن آ گیا ہے اور اب یہاں ہماری محنتوں کا اجر ضائع ہونے والا نہیں ہے۔

تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝٩٠ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ
الْبَلْدَةِ الَّذِيْ حَرَّمَهَا وَلَهٗ كُلُّ شَيْءٍ ز وَّاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ
الْمُسْلِمِيْنَ ۝٩١ وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ ج فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ
لِنَفْسِهٖ ج وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝٩٢ وَقُلِ الْحَمْدُ
لِلّٰهِ سَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَهَا ط وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝٩٣ ع

کیا تم لوگ اس کے سوا کوئی اور جزا پا سکتے ہو کہ جیسا کرو ویسا بھرو؟[۱۰۹ الف]

(اے نبیؐ، اِن سے کہو) ''مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ اِس شہر (مکہ) کے رب کی بندگی کروں جس نے اِسے حرم بنایا ہے اور جو ہر چیز کا مالک ہے۔[۱۱۰] مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں مسلم بن کر رہوں اور یہ قرآن پڑھ کر سناؤں۔'' اب جو ہدایت اختیار کرے گا وہ اپنے ہی بھلے کے لیے ہدایت اختیار کرے گا۔ اور جو گمراہ ہو اُس سے کہہ دو کہ ''میں تو بس خبردار کر دینے والا ہوں۔'' ان سے کہو، تعریف اللہ ہی کے لیے ہے، عنقریب وہ تمہیں اپنی نشانیاں دکھا دے گا اور تم انھیں پہچان لو گے، اور تیرا رب بے خبر نہیں ہے اُن اعمال سے جو تم لوگ کرتے ہو۔ع

[۱۰۹ الف] قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اس امر کی تصریح کی گئی ہے کہ آخرت میں بدی کا بدلہ اتنا ہی دیا جائے گا جتنی کسی نے بدی کی ہو اور نیکی کا اجر اللہ تعالیٰ آدمی کے عمل سے بہت زیادہ عطا فرمائے گا۔ اس کی مزید مثالوں کے لیے ملاحظہ ہو، یونس، آیات ۲۶، ۲۷۔ القصص، آیت ۸۴۔ العنکبوت، آیت ۷۔ سبا، آیات ۳۷، ۳۸۔ المؤمن، آیت ۴۰۔

[۱۱۰] یہ سورۃ چوں کہ اس زمانے میں نازل ہوئی تھی جب کہ اسلام کی دعوت ابھی صرف مکہ معظّمہ تک محدود تھی اور مخاطب صرف اس شہر کے لوگ تھے، اس لیے فرمایا ''مجھے اِس شہر کے رب کی بندگی کا حکم دیا گیا ہے۔'' اس کے ساتھ اس رب کی خصوصیت یہ بیان کی گئی کہ اس نے اسے حرم بنایا ہے۔ اس سے کفارِ مکہ کو متنبہ کرنا مقصود ہے کہ جس خدا کا تم پر یہ احسانِ عظیم ہے کہ اس نے عرب کی انتہائی بدامنی اور فساد و خونریزی سے لبریز سرزمین میں تمہارے اِس شہر کو امن کا گہوارہ بنا رکھا ہے، اور جس کے فضل سے تمہارا یہ شہر پورے ملک عرب کا مرکزِ عقیدت بنا ہوا ہے، تم اس کی ناشکری کرنا چاہو تو کرتے رہو، مگر مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ میں اس کا شکر گزار بندہ بنوں اور اسی کے آگے سرِ نیاز جھکاؤں۔ تم جنھیں معبود بنائے بیٹھے ہو ان میں سے کسی کی یہ طاقت نہ تھی کہ اس شہر کو حرم بنا دیتا اور عرب کے جنگ جو اور غارت گر قبیلوں سے اس کا احترام کرا سکتا۔ میرے لیے تو یہ ممکن نہیں ہے کہ اصل محسن کو چھوڑ کر اُن کے آگے جھکوں جن کا کوئی ذرہ برابر بھی احسان مجھ پر نہیں ہے۔